شاھد زبیر
(طویل نظم)

بازگشت

(طویل نثری نظم)

شاہد زبیرؔ

بازگشت

(طویل نثری نظم)

شاہد زبیر

0323-8636111

زیر اہتمام۔ یوشع بکس

٦٩۔ نشیمن کالونی، ملتان

061-6512747

ٹائٹل گرافکس

جواد جوجی

کمپوزنگ: صلاح الدین، آکاش کمپوزنگ سنٹر، ملتان

0300-6393072

پرنٹرز: شاہکار سعیدی پرنٹنگ پریس۔ ملتان

اشاعت فروری 2013ء

قیمت 200 روپے

پبلیشرز دستک پبلی کیشنز گول باغ۔ گلگشت ملتان

Cell: 0302-7766622(dastakpublication@yahoo.com)

ساحر شفیق کے نام

مصنف کی تخلیقات

......کمال مطلوب — تحقیقی مضامین

......آگہی — تحقیقی مضامین

......ترغیب — دینی مقالات

......حاجت مطلوب — مجموعہ وظائف

......قرآنی پیشین گوئیاں — قرآن پاک سے

......کیمیاء سعادت — تخلیص

......کشف المحجوب — تخلیص

......کیمیاء ہدائت — تصوف

......حکایات اولیاء — تاریخی ادب

......حکایات صفوریؒ۔ غزالیؒ — تاریخی ادب

......کسب کمال — دینی مضامین

......گھاس پر لکھی کہانیاں — افسانے

......برف پر لکھی کہانیاں — افسانے

......زمین پر لکھی کہانیاں — افسانے

......مقالات جیلانیؒ — خطبات

......اپنائیت کا سفر — نثری نظمیں

......منسوخ نیند — نثری نظمیں

......سوچ میں بیٹھے رنگ — نثری نظمیں

......کروسان — نثری نظمیں

......سرخ موسم — نثری نظمیں

......کمہار کے برتن — نثری نظمیں

......سات سطروں کی کہانیاں — نثری نظمیں

......دیوانے کا روزنامچہ — نثری نظمیں

......برف کی قاشیں — نثری نظمیں

......گھنے جسم میں ملاقات — نثری نظمیں

......چڑی کہانیاں — مختصر نظمیں

......نمائندہ امریکی نظمیں — ترجمے

......مونوگراف — نثری نظمیں

......بازگشت — طویل نثری نظم

آنے والی کتابیں

......آپ ﷺ (سیرت النبی ﷺ)

......نبیوں کی کہانیاں (قرآن پاک سے)

ملنے کا پتہ

یوشع بکس 69 نشیمن کالونی بوسن روڈ ملتان 061-6512747

بازگشت کی بازگشت--ایک تخلیقی اظہاریہ

نثری نظم لامحدود فکری احکامات کی حامل صنف ہے۔ ایک تخلیق کار زندگی کے ہر ممکنہ رویے، جہت اور جذبے کو بہ خوبی اپنا تخلیقی سرمایہ بنا سکتا ہے۔ بالخصوص زندگی، اس تضاد کو نہایت بے باکانہ انداز میں پیش کرسکتا ہے۔ جو تضاد ایک عالم گیر گاؤں میں رہتے ہوئے قوموں، طبقوں، تہذیبوں، زبانوں اور مذہبوں کے درمیان موجود ہے اور عصر حاضر کی صورت حال میں مزید پیچیدہ تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ دوسری طرف نثری نظم کا ایک مسئلہ اس کے فنی اظہار اور بیان کا ہے۔ بہ ظاہر یہ تاثر ہے کہ بحور وقافیہ سے آزادی تخلیقی عمل کو بڑھاوا دینے اور اپنا ماضی الضمیر بے دھڑک بیان کردینے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ مگر شاید یہ تاثر اتنا سادہ، آسان اور سامنے کا نہیں بلکہ نثری نظم میں میسر اسی آزادی نے اِسے پابہ زنجیر بھی کر کے رکھ دیا ہے۔ کہ نہ تو اب بحر کی روانی ہے اور نہ ردیف وقافیہ کی موسیقیت۔

یوں یہ عمل اِن حربوں کی عدم موجودگی کے سبب پیچیدہ اور الجھا ہوا مسئلہ بن گیا ہے۔ نثری نظم کی مثال ایک ایسے ملحد کی سی ہے جو خدا، تقدیر، دعا، غیبی مدد، صبر اور اس انداز کے دوسرے سہاروں پر یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی اسے ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اپنی تقدیر خود بنانی پڑتی ہے اپنی غلطیوں کی معافی نہیں مانگ سکتا۔ نہ اسے دعا کا سہارا میسر ہے جو اپنی شکستی وکمزور لمحوں کو اپنا مقدر کا لکھا قرار نہیں دے سکے اسی طرح نثری نظم کو بھی اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ اسے خود پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ بحور کے مدجذر، ردیف وقافیے کی کرشمہ سازی، زحانات کی معجز نمائی اور مصرعوں کی ترتیب سے پیدا ہونے والے تاثر کی بجائے صرف اور صرف اپنی فکری اپج اور اسلوب پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور اس کے ہمراہ ہنرمند تخلیقی رویے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے یہاں بحور وقافیہ سے عاری ہر تحریر کو نثری نظم کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے اور غیر تخلیق کار نیم تخلیق کار خود کو تخلیق کار کے منصب پر فائز سمجھتا ہے۔ میرے خیال میں نثری نظم مشکل، پیچیدہ اور ٹیڑھی صنف ہے۔ اس دودھاری تلوار کا شکار اکثر اوقات خود تخلیق کار کو ہی بنتے دیکھا گیا ہے۔

''بازگشت'' شاہد زبیر کی طویل نثری نظم کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے وہ نظم ونثر میں اپنے تخلیقی و فور کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے اگرچہ ذرا دیر سے لکھنا شروع کیا تاہم جس تیزی اور سرعت سے

بازگشت.....

انہوں نے تخلیقی مراحل طے کیے ہیں وہ قابل تحسین ہی نہیں قابلِ رشک بھی ہیں اور مجھ جیسے برا لکھنے یا لکھنے سے کترانے اور خوف کھانے والوں کے لیے باعثِ عبرت بھی۔ انہوں نے مختصر ترین نظموں اور افسانچوں سے لے کر طویل نظموں اور افسانوں تک ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب ٹھہرے۔ وہ مجلسی انسان ہیں اور مجلس میں اپنے نکتہ نظر کو بڑے بے باکانہ انداز میں بیان کرنے اور حوصلہ مندی سے اختلاف سننے کا شعور رکھتے ہیں اور اسی فکری ڈسکورس کا باعث وہ نئی دنیاؤں سے آشنا ہوتے رہتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی ان کی طویل نثری نظم ''بازگشت'' کی جوان کے تخلیقی وفور کی ایک اور مثال ہے۔ ''بازگشت'' کا عنوان اپنے طور پر خاصا معنی خیز ہے۔ ہ کسی تخلیق کار کی بلند آہنگ خود کلامی بھی ہے اور خود آشنائی کی وہ لذت بھی جس سے ہمارے اکثر تخلیق کاروں کی سماعتیں محروم ہیں۔ یہ ''بازگشت'' ایک صوفیانہ تجربہ بھی ہوسکتا ہے اور سرابِ مسلسل بھی۔ ''بازگشت'' کے جلو میں خیال کی باز آفرینی بھی ہوسکتی ہے اور لاحاصلی کا نوحہ بھی اور یہ ''بازگشت'' عہد حاضر کے انسان اور اقتدار کی شکستگی بھی ہے اور ذات کے اندر نا کام رہ جانے والی خواہشوں کی سسکیاں بھی۔ غرض آپ کسی بھی حوالے سے دیکھیں اور محسوس کریں۔ آپ ''بازگشت'' کی معنویت کو تہہ دار ہی پائیں گے۔

شاہد زبیر کی یہ طویل نظم فکر و اظہار پر دو اعتبار سے توجہ طلب تحقیقی رویوں کی حامل ہے کہ اس میں معنی کا بکھراؤ درحقیقت اپنی ذات کے بکھراؤ کے ساتھ جڑا ہے اور جس طرح پوری نظم میں معنی اپنی وحدت کی قوس میں سرگرداں ہیں اسی طرح شاعر اپنی ذات کی شناخت کا جتن کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے لیے وہ ماضی و حال کو بہ طور استعارہ استعمال کرتا ہے اور استعارے کی معنویت اور پہلوؤں سے اپنے ہونے کا جواز تلاشتا ہے۔ نظم میں بولنے اور سننے والا اگرچہ ایک ہی فرد ہے تاہم یہ گویائی اور سماعت کا عمل و تاریخ اور عصر حاضر کی حسیت کے ساتھ ملکر ایک اجتماعی تجربے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ ایک ایسا اجتماعی تجربہ جہاں ماضی کی معنویت حال کی لایعنیت کو ظاہر کرتی ہے اور شاید یہی لایعنیت (Abus) ہمارا مستقل بھی ہے۔

شاہد زبیر اپنی آواز کی طاقت مگر اس کی نحیف ''بازگشت'' کو مزید کمزور تر ہوتا دیکھتے ہیں اور یہی المیہ شاید اس نظم کے بطون میں موجود ہے کہ آواز کی معنویت کس طرح ''بازگشت'' کی لایعنیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ''یہی آواز کی طاقت'' ماضی اور تہذیبوں کی طاقت ہے۔ نظم میں یونانی سیفو کی آواز، مصر کے

بازگشت.....

اہرام، ہندوصنمیات کے کرداراور دیو مالائی فضا نے بہ طور استعارہ نظم کے کینوس کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ تاہم ''بازگشت کی لایعنیت'' ان تہذیبوں کی بازگشت بن کر رہ گئی ہے اور اب نئے رویے، نیا نظام اور نئے اقدار نظام میں ماضی کی ''بازگشت'' کہیں سنائی نہیں دیتی۔

میرے زنگ آلود خواب
بھربھرے ہو کر، میری ہتھیلوں پر گر پڑے ہیں
لمحوں کی طنابیں پکڑنے کی شکستی، ماند پڑ گئی ہے
ممکنات کی لُغت بھسم ہو گئی ہے
انگلیوں کی پوروں پر اب
صرف دل بجتا ہے
میں معلوم کی مٹی جھاڑ کر
تغیر کو پھیلنے نہیں دیتا

☆☆☆☆☆

میرے چہرے پر حیرتیں لکھی ہیں
بت تراش ان حیرتوں کو کیسے تصویر کریں گے
میری یادیں میرے ساتھ اہرام میں دفن کی جائیں گی
کون جانے گا انگور کی بیلوں پر
سیفو رقص کرتی ہے، میں اس کو کشید کرنا چاہتا ہوں

☆☆☆☆☆

سیڑیوں سے اترتے ہی
ساری دنیا میں بدلاؤ آ گیا
تاریخ، دیدیں تو محرکات مباشہ
جسم فروشی، اسقاط حمل، بدکاری اور ہم جنسی سے بھری پڑی ہے
مگر مجھے دروپدری پر ترس آتا ہے

بازگشت.....

پانچ سگے بھائیوں کی اکلوتی سواری

اور وہ یمنا، یمنی جڑواں بہن بھائی

جب یمنی نے بھائی کو کمزور ہونے کا طعنہ دیا

☆☆☆☆☆

محبت وہ لفظ ہے جو عالموں اور عارفوں کی

پر تکیہ ہے

علم اور محبت سے بے بہرہ لوگ، تمام عالم پر

محبت کو نظر رکھتے ہیں

یہی بھوت یکیہ ہے

میں اپنے زائچوں کو اگر کھول دوں تو تم

اپنے مقصود سے باہر نکل جاؤ گے

یونان سے نکل جاؤ گے

یا بڑی دوشیزائیں، زیس اور تیموسین

ان کی بیٹیاں، رزمیہ شاعری، تاریخ، غنائیت

المیہ نگاری، رقص و سرور، تغزل، عارفانہ شاعری

فلکیات اور طربیہ سے جڑی تھیں

میں......زیس......آسمان کا بیٹا تھا

☆☆☆☆☆

میں جس زمانے میں تھا، اس کی زبان وہاں کے لوگ سمجھ نہ سکتے تھے

مجھے جاننے والا، وہاں کوئی نہ تھا، جسے مدد کے لیے پکارا جا سکتا

میرا حافظہ ذروں میں بٹ چکا ہے

واقعات کا آنا جانا، سرسامی منظروں تک محدود ہے

☆☆☆☆☆

بازگشت.....

اور اس انداز میں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں جہاں تہذیبیں اور تاریخ زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر ایک ساتھ سفر کرتے ہیں۔ ان تہذیبی کرداروں کا رویہ، وہ کردار ارضی ہوں، خواہ سماوی، اسی بازگشت کی ایک لہر ہے مگر اب یہ بازگشت نحیف و لاچار ہو چکی ہے اور آج کے عہد کی لایعنیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ''بازگشت'' میں شاہد زبیر نے محبت، نفرت، منافقت، خود غرضی، عقیدہ، امید، آرزو مندی، ناآسودگی، قربانی غرض زندگی کے لاتعداد رویوں کے ماضی و حال کے تضاد میں پیش کیا ہے اور دلچسپ بات یہ کہ نظم کا آہنگ عہد حاضر سے مابعد جدید رویوں سے، بہت حد تک ہم آہنگ ہے۔ یہ ''بازگشت'' معنی کے التوا اور عدم مرکزیت کی حامل ہے۔ متن (نظم) کا کھلا پن معنی کا حتمی تعین نہیں کرتا محض جھلکیاں اور سائے ہیں جو وقت اور زمانوں کی اوٹ سے ظاہر اور غائب ہوتے رہتے ہیں۔ معنی کی یہی آنکھ مچولی اور موجودگی و عدم موجودگی اسے مابعد جدید رویوں کے قریب تر لے آتی ہے۔

نظم کی کرافٹ بھی خاصی پیچیدہ اور دلچسپ ہے۔ عموماً نثری نظم میں تین فنی حوالوں کو ہمیشہ اہمیت رہی ہے۔ اوّل نثری نظم میں تمثال آفرینی کا معیار کہ شاعر نے کتنی تلمیحیں اور نئی تمثالیں تراشی ہیں۔ دوم معروضی حیثیت متضاد (متصادم بھی) اظہار یہ کہ کس طرح ایک شاعر اپنے گرد و پیش کو الٹ کر دیکھتا ہے اور اس تضاد کو بامعنی کس طور پر بناتا ہے۔ سوم یہ کہ شاعر قول محال (Paradox) کا استعمال کس حد تک کامیابی سے کرتا ہے۔ آج ہمارے یہاں لکھی جانے والی نظم میں یہ تین خصائص عموماً نظر آتے ہیں یہ اور بات کہ ان خصائص کے بیان کی صلاحیت ہر شاعر میں نہیں ہوتی۔

شاہد زبیر نے اپنے فنی کرافٹ سے ان خصائص کو اپنی اس نظم میں برتا ہے۔ اب وہ کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں اس حوالے سے میں کوئی تنقیدی حکم تو نہیں لگا سکتا تاہم یہ بات کہنا ضروری ہے کہ بھرپور تخلیقی وفور اور سرشاری کے سبب یہ نظم ایک ''تخلیقی کل'' کی شکل ضرور اختیار کرتی ہے اور یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر سید عامر سہیل

پروفیسر ڈاکٹر سید عامر سہیل

سرگودھا یونیورسٹی جنوری ۲۰۱۳ء

بازگشت

یہ بازگشت پتریاں سے جانے والوں کے لیے ہے

یہاں داخل ہونے والوں کو،

یہ پھل بھوگنے پڑتے ہیں،

عاشق اپنا جوٹھا، چنڈال کو بھی دے گا تو

اس کا سینک،

آگ میں پڑ کر جل جائے گا

پیاریاں، خاندان میں، برہم تیج پیدا کرنے پر مامور ہیں

وہ تو اگنیوں کی بدیابیان ہیں

زمین کو ان راکھشوں سے پاک کرنا،

مجھ پر ممکن نہیں،

برہما پہلے دن سے ان کا حمائتی ہے،

ان کی آنکھیں، پرش کو دھیان میں سما لیتی ہیں،

ننگی تصویروں پر،

ہمیشہ ایک کھال منڈھی رہتی ہے

پورنوگرافر کا کمال یہ ہے کہ

اس کی کھال کو اتار کر،

اندر کا منظر حنوط کرے

بچہ، بوڑھا اور نوجوان یکساں مستفید ہوں

طوائف تشنگی کے لئے کافی نہیں،

ہم جوان کی آنکھوں میں رہتے ہیں،

چتیّن کی اُپاسنا کرتے ہیں،

میرے بستر کی گرمائش

مجھے رات بھر

بوسوں کے تحفے بھیجتی ہے

کھڑکی کے ٹوٹے شیشوں کی دراڑوں سے

جھلملاتی سرد روشنیاں،

کہرے کی دبیز چادر سے،

پالے کی برفانی سیلن

جھیل کر،

دبادب اندر داخل ہوتی ہے

اس کے تازہ قدم

جوتوں کے نشانوں کو

نظروں سے غائب کر دیتے ہیں،

مہیب سناٹا، چھا جاتا ہے،

ہم جوان کی آنکھوں میں رہتے ہیں، مر جاتے ہیں،

شاستروں کی بدھی کے مطابق،

ہمارا کریا کرم ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے،

کیونکہ ہماری بازگشت نہیں ہے،

لحاف پر بے تو جہی کا رنگ برسوں کی گرد کو چاٹتا ہے

میں خاموشی سے دروازہ بند کر کے،

گلی میں نکل آتا ہوں۔

کہرے میں لپٹی ایک کتیا

سڑک کے بیچوں بیچ پڑی ہے

لگتا ہے، جیسے برف کا کوئی طوفانی بہاؤ،

اٹھا کر اُسے یہاں پھینک گیا ہے،

مجھ سے آنکھ ملا کر،

وہ مخالف سمت میں چل پڑتی ہے،

برفانی رات میں، میں اپنا سُور لیے،

میں پن چکی کی اوٹ میں پہنچ گیا ہوں،

یہاں کچھ کل پرزوں کے درمیان،

اس کا بدن،

کسی بوری کی طرح جھول رہا ہے

وہ گونگا،

بے انصافیوں پر چپکے بیٹھا رہتا ہے،

من سے دھیان ہی نہیں دیتا

اسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کس وقت

کیا بولنا چاہیئے،

پھر بھی ہر میٹنگ میں،

بلایا جاتا ہے

خوب تاریخ کماتا ہے

جب میں کئی سال باہر رہ کر آیا تو پوچھا

تم میرے بغیر کیسے جیتے رہے؟

میں نے کہا، جیسے اندھے رہتے ہیں،

جو آنکھ سے تو دیکھتے نہیں مگر پران سے سانس لیتے ہیں،

یہ خوشی بھی ایک ریل پیل ہے،

عارضی مگر جوشیلی،

بُجھتے ہوئے شعور میں بھی بول دیتی ہے، جیسے

نچلی منزل پر رہنے والی بڑھیا کو،

ہر بات کی خبر رہتی ہے،

جن عورتوں کے شوہر،

میدانِ جنگ میں تھے،

کھلم کھلا اعلان مباشرت کرتی تھیں

مگر بڑھیا کے حصے میں، محض خوشبو کا آسرا تھا،

چھوکریا کے بازو کی کلائی سے بانہہ تک،

کئی جوڑی مچھلیاں، کلبلا رہی تھیں،

اس کے سر کا دوپٹہ، نیچے تک ڈھلکا تھا،

کھنڈالے کے موڑ پر،

رُوپ پیتے ہوئے،

چائے اور پکوڑوں کے کھوکھے پر،

جوانی سے بھری اُس لڑکی سے

میں نے ایک پتّل پکوڑے، بنا مرچ کے مانگے تھے،

اس گاؤں کی دیواریں سوکھی تھیں،

وہاں دن دیہاڑے چم چوری ہوتی تھی،

وہاں پانی نہیں تھا،

بجلی گرے گی، ہڑبڑیا بجلی،

پھر پھوہیا ورشا میں،

درختوں کی پتیاں چھپ جائیں گی

کھلے میدانوں میں، پُروائی کی گھاس اُگ آئے گی

کاغذ والے نقشے پر،

بانس کا بیچو بن، جاگ پڑے گا

گاؤں کا روپ، شام ڈھلتے ہی، لوٹ جائے گا،

لالٹین کی روشنی میں،

نئے روپ جگمگائیں گے

رُوپ والی گھرنی

بت کشی پر اتر آئے گی

ماتا، تم ہی چپ رہو،

یہاں خوب چلے گی۔

کیا چلے گی......

چائے کی دوکان......اور کیا

پوپلی بڑھیا ہنس پڑے گی،

اس کا کمرہ محض،

بھنے ہوئے، بھٹوں کی خوشبو سے گرمایا ہوا تھا،

اسے یاد تھا وہ تھیٹر،

دل دہلا دینے والا بھینکر ڈاکو

بوڑھے انگریز جج کے سامنے،

ہاتھ باندھے کھڑا تھا،

یُو سی، مسٹر جج، ڈونٹ کال می چھوکرا،

آئی ایم میٹرک سٹوڈنٹ،،

فلم نے تھیٹر کو کھالیا،

وہ آخری شو تھا،

اس کا بیٹا، تھیٹر میں

چور بنتا تھا،

آخر حرامی کا پلا، چور ہی بن گیا،

اپنا گھر بنا کر رہ سکتا تھا،

کپڑے جوتے پہن سکتا تھا،

پیسے دے کر اپنی پسند کی کوئی بھی چیز،

خرید سکتا تھا،

پھر بھی ان کو چھلتا تھا

جس کے پاس سونے کو گھر نہیں تھا،

حجامت کے لیئے استرا نہیں ملتا تھا

سور کا بچہ......

چوہے اور آدمی کے درمیان کی کوئی چیز نکلا

آدمیوں سے ڈرتا تھا،

چوہوں کو کاٹتا تھا،

ماں کو بیٹا نہ ملا، اور اُسے

کوئی یار بھیتر سے

پنڈ سے آکر تو وہ سینکڑوں میں گم ہوئے

واپسی کی لاریوں کے روٹ بدل گئے

میٹرک کی تعلیم،

بائیں چھین لیتی ہیں،

پیپل کے پیڑ کے نیچے،

بچھی دری، نٹھلو استاد، سب واہ واہ میں ہیں،

موٹی، گھٹی، ننھی کی سریلی آواز میں گم ہیں

چاول کا ٹمن، منڈیر پر رکھے، دیوار تماشا

کھڑی چارپائی اچانک

چُرمرا کر گر گئی،

ماں کلاوتی کا کولھا، دوسری بار ٹوٹا تھا،

بھوں بھوں سے اماں روتی تھی،

سنتا کوئی نہ تھا،

سڑک کاٹتے،

روشنی نے اندھیرا نگل لیا،

میں اپنی عادتیں لے کر کھڑا ہوں

مجھ میں عجیب علتیں ہیں

مجمع دیکھ کر رک جانا

بندر کا تماشا،

نیولے کی لڑائی،

چلتی سڑک کے کنارے

کھوکھے پر بیٹھ کر چائے،

بھیڑ میں بوڑھوں کے رنگ ڈھنگ

پرانے اخبار میں رحمن ڈکیت کی خبریں

سڑک پر نام اور حلیہ بدل کر چلتی لڑکیاں

والدین کا مذاق اڑاتی،

اپنے حق کی تصدیق کے لئے

عدالتوں کی جانب رواں دواں

درانتیاں

بانجھ زمین سے،

کیا کاٹ سکیں گی

انہیں گھروں میں دفن رہنے دو

گڑھوں سے کبھی خواب نکلتے ہیں،

پڑا رہنے دو، جہاں پڑے ہیں،

برآمد ہوئے تو شرمندگی لائیں گے

سنگلاخ چٹانوں پر

بھوکے گدھوں کا دائرہ ہے،

میں زمین اڑا نہیں سکتا،

چٹان، لہو آلودہ ہے،

گدھوں کا رقص جاری ہے،

بدن کے ریشے بے بس پڑے ہیں،

تم میرے چھاتی سے موٹی رگیں نکال کر

باہر رکھ دو،

پچھنے لگانے والیاں، آتی ہی ہوں گی

مجھے کدالوں سے نکالی، ہڈیوں کی

فصلیں اگانے دو کہ میں نے

آنے والے دور کی تاریخ لکھنی ہے

اس بد بخت سیاہ سانپ سے

روشنی کا سایہ ہٹا دو،

مجھے اپنے باپ سے ڈر لگتا ہے

تم مجھ پر تاسف کا اظہار نہ کرو

میں سیاہ کوئلوں سے گفتگو کرتا ہوں،

خشک خون کی تجارت کرتا ہوں،

چپ کی کہانیاں، کھال پر لکھتا ہوں

سیاہ چھت پر میرے خواب لٹکتے ہیں،

پنکھا انہیں، کمرے میں اڑائے رکھتا ہے،

برسوں کی پرانی دوستی ہے،

آؤ سانپوں کے خون سے،

مشکیزوں کو بھر لیں اور

مقتولوں کی قبروں کو ٹھنڈا کر دیں
لوگ سینوں پر دم کرا آئے ہیں،
بچھوؤں کا زہر ان پر اثر نہیں کرتا،
اچھا ہے، تم ان کی گردنیں اڑا دو،
بے یقینی کے ہاتھوں بہائی گئی، خون کی ندیاں،
صلیبوں سے لٹکی پڑی ہیں،
سیاہ ڈوری سے بندھے، ضمانتی حروف
یکا یک نکل بھاگے ہیں
ٹیبل پر لیٹی بے ہوش لڑکی پر،
ایک وزنی لیمپ کھسکا کر،
اس کا پیٹ روشن کر دیا گیا ہے،
اس کو کاٹنے سے پہلے،
اس کے سیاہ حصے پر، کالک مل جا سکتی ہے،
ایک میت جو آج صبح لائی گئی تھی،
کسی دیوانے نے اس کی قبر
کھود ڈالی ہے،
موت کے وسیلے، بے اثر ہیں،
ساری سڑک پر گندا خون پھیل گیا ہے،
گھوڑے کا سم کٹ کر،
لٹک گیا تھا،
کچھ لوگ اس پر مٹی کا تیل چھڑک رہے ہیں۔

تمہارے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے

میری سانس پھول گئی ہے

آخری سیڑھی پر کھڑے،

میرے چہرے پر عجیب سا تاثر ہے

آج بھی تالا دیکھ کر میں،

وہ ٹھوکر،

جو تم نے مجھے رسید کی تھی

بوٹوں کے خالی ڈبے میں

پیک کر کے چھوڑے جاتا ہوں

اگر تمہارے ذہن میں،

میرے خیال کا گزر ہو تو میری جانب سے اسے

تحفہ سمجھ کر قبول کر لینا

اس ایک شخص کی نفرت نے میرا اندر

آگ سے بھر دیا ہے

میرے دانت کھٹے کر دو،

میرا ایزیہ باہر نکالو،

کوفے کی اس فضا میں، غربت کی نحوست ہے

قاتل ہیں، مقتول ہیں، بھڑے ہیں،

بین دائرہ وار پھرتے ہیں،

غازی سیڑھیوں پر بیٹھے رہے،

پجاری پرنام کر کے چلے گئے

محبت میں فاصلے کم نہیں ہوئے

ہجرت میں میری سواری،

میری قبر کو لوٹ آئی،

قتل ہونا، میرا مقدر تھا،

ہمارے خوابوں کی سیج پر،

تیر آندھیوں کا قبضہ تھا،

رات دن سے مختلف کہاں تھی،

کچھ لوگوں نے تلواروں سے،

ہماری گردنیں اڑا دیں،

ہم پتھر پر بیٹھ کر ہنستے رہے

کیچوے ساری مٹی کھا گئے

ٹڈوں نے جنگل نگل لیے

ہوا کہتی تھی، آدمی کو چاٹ لو

شکست سے دوچار کرنے کو،

ریت ہی کافی تھی،

کمزوری کا مشروب،

ساتھ ہی بہتا تھا،

انہوں نے مگر تلواروں نیزوں کا انتخاب کیا،

ہمارے ہونٹوں سے چھوتی، بالآخر

تپتی ہوئی سرخ ریت

کامرانی کے قدموں سے لپٹ گئی،

وہ پتھروں کو کھینچنے کا ہنر جانتے تھے،

اپنی نفرت کی آگ بجھانے کو

ہم پر ہزاروں سلوں کا اہرام بنایا

میرے بھائیوں کو تم نے کبھی،

رقص میں دیکھا ہے،

پر تپاک دفن کے بعد، ان پر

خوشی کا دن آیا ہے

کامنائیں کہاں بچی چیزیں ہیں،

ان پر کسی کا اختیار نہیں،

کون کہتا ہے، ہر دے آکاش میں،

آدمی کے لیئے ہر شے موجود ہے،

اس رمز کو جاننے والا محتاج فقیر ہے مگر

اگیانی تو انہیں من سے باہر ڈھونڈتا ہے

اس کی جان کے ساتھ، جھوٹ پاپ جڑا ہے،

یہ کامنائیں، ساری کی ساری،

جھوٹ سے ڈھکی ہیں،

مرجانے والا بھی، جھوٹا ایک خواب تھا

نظروں سے اوجھل ہوا،

اگیانی روئے نہیں تو کیا کرے،

کامنائیں آسمان سے پانی کا گرا قطرہ

جس سے مچھلی پیدا ہوئی

تو مچھلی نے کہا،

یہ پانی تھوڑا ہے،

قطرہ پھیل کر، سمندر بن گیا،

ہوا، زمین کو دونوں پروں پر بٹھا کر،

ساری خاک، پر پھیل گئی

ہمیں مسکنوں میں رہتے، ہزاروں سال بیت گئے

مگر اس وسعت میں ہم دونوں تنہا ہیں،

میری زندگی میں محبت کی داستان

مرار سا کی لکھی داستان کا ایک مٹا ورق ہے

جسے اوپر سے نیچے کو لکھا گیا،

اس کو سمجھنے کے لئے اسی سال کی تعلیم ضروری تھی

اتنی پڑھی لکھی عورت مجھے مل نہیں پائی

ان جلی دیواروں پر، میرے اجداد کی تصویریں لٹک رہی ہیں،

لوگ اپنا شجرہ سنبھال کر رکھتے ہیں،

میں نے ان کچی دیواروں کو تھام رکھا ہے،

یہی میرے خاندان کی تاریخ ہے،

یہی میرا حسب نسب ہے،

میرا مسکن بانسوں کا جنگل ہے،

کسی دن کو یاوری ہو گی،

کوئی روز نیزہ پار اترے گا، امن سفید رنگ ہے

سفید رنگ نور نہیں ہوتا، اجالا چاندی نہیں ہوتا

روشنی کا چراغ بدن میں ہوتا ہے

کسی نے

مجھے سجانے کی خاطر، میرے بالوں میں

چاندی کی تاریں بھر دی ہیں مگر میری

آنکھ کا پانی چرا لیا ہے،

ابھی تو میرا بدن تازہ ہے،

رونا ہے تو رو لے، اے ہجوم،

ایک بار اُٹھ گیا تو تمہیں آنسو نہ آئیں گے،

میری غنودگی دراز ہوتی جاتی ہے،

درد مٹتا جاتا ہے،

تمہیں اس صورت سے نکلنا ہے تو

اس غبار کی آڑ میں نکل جاؤ،

محبت کے لیئے میری زندگی بہت تھوڑی تھی

ان کے آنے میں ابھی کئی دن باقی تھے

میں ان کے ساتھ کیکلی کھیلنا چاہتا تھا،

مجھے سٹاپو بھی پسند تھا،

مگر میں کیا کرتا، ان کے پاؤں تو الٹے تھے،

دیر تو ہونی ہی تھی،

میری زبان باہر لٹکی ہے،

میرے چہرے پر حیرتیں لکھی ہیں،

بت تراش ان حیرتوں کو کیسے تصویر کریں گے،

میری یادیں میرے ساتھ اہرام میں دفن کی جائیں گی

کون جانے گا، انگور کی بیلوں پر

سیلو رقص کرتی تھی، میں اس کو کشید کرنا چاہتا تھا

فرعون کے دربار کا میں ادنیٰ سپاہی،

مالک کی برابری کا دعویدار تھا،

دونوں کی نگاہیں رقص پر ٹکی تھیں،

میں شہوت کے منہ زور گھوڑے کو،

میدان میں سرپٹ بھگاتا پھرتا،

تیرہ سال کی مورتیں سخت وحشت کو گھیر لاتی تھیں

میرے اندر سوروں کا باڑہ تھا،

اسی ترنگ میں، ایک رات، میں سیلو کے ڈیرے پر

اپنی نمازیں بھول آیا تھا،

سودہ ہے، میں نہیں ہوں

پول میں نہاتی لڑکیاں،

میرے حواس چھین لیتی تھیں

پورن ماشی کا چاند

کتنا ننگا ہوتا ہے

ساتویں سال کے نیلے چاند میں،

اس کی انگڑائی، اس اژدھے سے ملتی تھی

جس سے مجھے محبت تھی

مدقوق سینوں، باریک ٹانگوں والی

ریمپ پر چلتی لڑکیاں، دلکشی کا تاج پاتی تھیں،

ایک روز میرا مکان یکا یک غائب ہو گیا۔

مزار، پیپل، موڑ، سب کچھ وہیں تھا

میں نے سوچا، بڑھاپے نے میری یاداشت چھین لی ہے،

مگر دکھائی پڑتا تھا،

مکان کی زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو کر،

ملحقہ مکانوں کے صحنوں میں تبدیل ہو گئی،

شائد نقشہ ہی گم ہو گیا تھا،

بچے ندی کنارے کھیل رہے تھے

نالے کے کنارے اُگی، لمبی گھاس کی پھنگوں سے،

ننھے جہاز جیسا، ایک معصوم ٹڈا.......

میں نے ایک ٹڈا پکڑ لیا،

سبھی بچوں کا ننھے پنکھوں سے کھیل شروع ہو گیا،

انہوں نے پنجرے بنانے کا کھیل ایجاد کر لیا تھا

اعلان ہو رہا تھا، بستی والو!

اب یہ گھر ٹوٹنے کو تیار ہیں،،

دو منٹ اور یہ بستی مٹی میں ملا دی جائے گی:،

ایک بچہ لوری، اپنی سکھن کے ناڑے میں گیند پھنسا کر

بلڈوزر بنائے آگے بڑھ رہا تھا،،

فرش پر بھاری لوہے کے گھسٹنے کی،

آواز آ رہی تھی، کوئی کہتا تھا، یہ سیلنڈر ہے، کوئی آکسیجن کا سلنڈر،

لگتا تھا کسی سیٹی پر لڑائی

پھوٹ پڑے گی،

ششما پوچھتی تھی، کیا ملٹری کا لوگ آ گیا

میرا پیٹ تو وزن سے لدا ہے، ہل نہیں سکتا

اور یہ فوجی لوگ......؟

مڑی ہوئی گردنوں والی بطخیں

ایک ایک کر کے دریا میں اتر گئیں

مضمون کا بنیادی خیال،

سارے فلسفیانہ تجزیوں کے بعد بھی

بلیک ہول سے باہر نہیں آیا

میں نے ۶۱۲ قبل مسیح میں،

اپنی ماں کے پیٹ میں تیرنا سیکھا،

نیلے سمندروں سے میری شناسائی

اسی دنیا میں ہو گئی تھی،

میں نے اپنی پیدائش پر خود سے وعدہ کیا

میں تمہاری محبت میں اس طرح جیوں گا

جیسے نیلے سمندر میں گھاس آ گئی ہے

میں نے تیری شاعری کو تقدیس کی نگاہ سے دیکھا

جس طرح، جمیلن کا جسمانی حسن

حروف تہجی کی کھلی ڈرائنگ کا کمال تھا،

وہ اعضا کی شاعری کے طاق میں بیٹھ کر،

دینی پس منظر سے غافل کرنے کی ماہر تھی

میں نسل در نسل، اس کا ہاری ہوں

میں اس کے حسن کی فصل کو، بوتا ہوں،

پرورش کرتا ہوں،

وہ اب بھی چاہے تو مجھے طلب کرسکتی ہے

وہ دسواں میوز ہے، میں کہایا

مٹی لین کے مکینوں نے بھی

اس کی قدر و منزلت کی

کوٹھے پر بیٹھی سیفو نے،

میرے اذہان پر قبضہ کرلیا تھا،

وہ یکا یک، ایک ولی کے درجے پر فائز ہوگئی تھی

وہ انسانوں سے کہیں زیادہ،

طاقت ور تھی،

کسی نے اس کا راز پوچھا، کہنے لگی

جاؤ اور جا کر، میرے نائب سے پوچھو.

وہ آج بھی زندہ ہے اور ہر رات مجھے

ملنے آتا ہے،

میں پرانی صدی کے بوڑھے کا روپ

دھار لیتا ہوں

ہم جھروکوں میں سرگوشیاں کرتے ہیں،

وہ دبی دبی سسکیوں میں، مجھے لوٹ آنے کا کہتی ہے،

کبھی کبھی اس کی ہنسی،

بے تاب ہو کر گونج اٹھتی ہے،

بھوت پریت کی بستی میں یہ بوڑھا

میرا گرو ہے اور چھوکری، میرے پچھلے جنم کی محبت

میرے بولے ہوئے لفظ،

جالے سمیٹے رہتے ہیں،

جب میں وہاں سے چلا آتا ہوں تو وہ،

اگلی رات تک، میری باتیں

ریوائنڈ کر کے سنتی ہے،

وہ بن چہرے کی عورت مجھ میں داخل ہو کر

کئی بار میری دنیا میں آنے کی کوشش کرتی ہے

مگر میرے ساتھ والے بستر پر

لیٹی ایک ڈائن، انگڑائی لے کر

اٹھ بیٹھتی ہے،

میرے زنگ آلود خواب،

بھر بھرے ہو کر، میری ہتھیلیوں پر گر پڑے ہیں

لمحوں کی طنابیں پکڑنے کی شکتی، ماند پڑ گئی ہے

ممکنات کی لعنت، بھسم ہو گئی ہے

انگلیوں کی پوروں پر اب،

صرف دل بجتا ہے،

میں معلوم کی مٹی کو جھاڑ کر

تغیر کو پھیلتے نہیں دیکھتا

بھاگتے پل گرنے کو تیار ہیں

دروازے کو سونگھنے والی ہوا نے

جھولیاں بھر بھر کے راکھ الٹ دی ہے

چاند کے مٹرے ٹھروں پر

آوازوں کی ساجھے داری تھی

سیڑھیوں سے اترتے ہی

ساری دنیا میں بدلاؤ آگیا!،

تاریخ، ویدیں، تو محرمات مباشرہ

جسم فروشی، اسقاط حمل، بدکاری اور ہم جنسی سے بھری پڑی ہیں،،

مگر مجھے درو پدری پر ترس آتا ہے،،

پانچ سگے بھائیوں کی اکلوتی سواری،،

اور وہ یمنا، یمنی، جڑواں، بہن بھائی،

جب یمنی نے بھائی کو کمزور ہونے کا طعنہ دیا،،

میں جانتا ہوں، قاتل سرخ سوچتا ہے،

وہ ایسا کر گذرتا ہے، مگر مجھے

دھوپ اور سایہ ایک سے ہیں

گم گشتہ دیوتا، میرے حضور آتے ہیں،

نادم ہو کر لوٹ جاتے ہیں،

وہ پچھتاوے کی راکھ اور گرد ہیں

ان کی عقل اور مردانگی، چھین لی گئی ہے،

موت ترکے میں کچھ نہیں چھوڑتی، بھگوان بھی نہیں

سقراط اور عیسیٰؑ نے کوئی تحریر نہیں چھوڑی اور

برہما، سوالوں کے جواب نہیں دیتا،

وہ کہاں ہے، کب ہے، کیوں ہے

ہم نہیں جانتے

اس نے کہا، میں نہیں جانتا، میں کون ہوں،

کہاں جاؤں گا،

میری عمر رفتہ گھاٹے کا سودا رہی،

گو کہ خدا میری آنکھوں میں تھا، لیکن

میری غبار آلود آنکھیں، اس کے نور کو

پہچان نہ سکیں،

گناہوں کے بوجھ میں، میں نہیں جانتا، اب

کون میرا منتظر ہے

میرے خیال میں دیوتا، محض خیال،

فالتو چیزیں ہیں،

مذہبی ریتیں، رسمیں، تاثیریں،

سب کی سب بے سود ہیں،

کبھی نہ پوری ہونے والی امیدیں ہیں،

پکڈنڈیاں ہیں، جو نجات کے راستے ہیں

حائل ہیں،

جسم، احساس تفہیم، شعور

سب عارضی ہیں، اندوہ گیں ہیں

میری قوت کو ٹھیکرے کی مانند،

خشک کر دیا گیا ہے

میری زبان تالو سے چپکی ہے،

بدکاروں کے گروہ نے مجھے گھیر رکھا ہے،

وہ میرے ہاتھ پاؤں چھیدتے ہیں

میری پوشاک پر قرعہ ڈالتے ہیں،

پتھروں کے عقیدت مند، انہیں وہ کہانیاں سناتے ہیں،

جو میرے تجربے سے نہیں گذریں،

ڈانواں ڈول پیکر، لمبی زبانیں نکالے،

خواجہ سرا بنے بیٹھے ہیں،

روحوں نے اپنے نوکیلے ناخنوں سے

اپنے بال نوچ لیتے ہیں،

پتلیاں غور سے تماشا دیکھتی ہیں

فریب خوردہ خدا، نخوت کے

عظیم مدفن ہیں، اپنے اژدھوں کی

حیرتوں کو نگل رہے ہیں،

میرے عذاب کے پاؤں نے

دوزخ جلا کر رکھ دیا ہے
لوگ اپنی جنت سے مغرور ہیں،

خباثت کے منحوس بھوت
چوہوں کی امداد پر اتر آئے ہیں جو
بوٹیاں نوچ لیتے ہیں، تعفن چھوڑ دیتے ہیں
میں نے اپنی چیخوں سے دوستی کر لی ہے
یہ ہر دم مجھے گھیرے رکھتی ہیں
مجھے بھی چیخ بننے پر اکساتی ہیں
مجھے اپنا اندر فاش کرنے دو، ورنہ
میری خاموشیاں، چیخ چیخ کر، ایک دن
مجھے ایک دھماکے سے پھاڑ ڈالیں گی،
پانی کے یہ قطرے، جو میری آنکھ پر ٹھہرے ہیں
پہلی بتی کا اشارہ ہیں،
کچھ دیر میں ان سے سرخی بہنے والی ہے
بھوک نے میری رانیں سکھا ڈالی ہیں
لاحاصلی کی شوگر نے مجھے برباد کیا
بوڑھے شیر کے منہ میں دانت نہیں ہوتے

میرے حصے میں ایک چرائی ہوئی لڑکی آئی تھی،
میرے گھر کی دیواریں، جاگ جاگ کر
اندھی ہوگئیں، تب
بے آواز اندھیرے نے، اس کی
زنجیریں کھول دیں،
مانوس کتا، اسے اگلی گلی کے موڑ پر
چھوڑ آیا
اب اپنے ہونٹ چوسنے کے سوا
کوئی چارا نہیں رہا
میں گیان کی گانٹھ کھول سکتا تھا
مگر اسے گپھا میں رکھنا، جائز ہے
میری ذات کا ایندھن سورج ہے
میں عورت سے ملے بغیر بہت سی مخلوق
پیدا کر سکتا ہوں
سات شعلے، سات لکڑیاں، سات ہوم
اور سات ہوک پیدا کر سکتا ہوں، لوک۔ مگر
یہ جو میری پسلی پر، ایک بھاری گٹھڑی ہے
میں اکثر اس سے ڈر جاتا ہوں

نوے کا زاویہ بناتے لوگ
آپس میں باہم جذب کیسے ہو سکتے ہیں
اپاہج پرندے، پیار نہیں پاتے
طوطیوں کے غول، رقص کناں ہیں مگر
ان میں بولنے والی طوطی نہیں ملی
میرے دنوں دانت، پیاس سے مر گئے
غاروں اور تہوں میں رہنے والے
اضافی حرکت کرتے ہیں، جن سے
سمندر اور دریا، نمودار ہوتے ہیں،
دوائیں اور رس پیدا کرتے ہیں،
روحیں قائم رہتی ہیں،
ایک روح کی آرزو تھی کہ وہ
ماں کی کوکھ ہی میں، مر جائے،
تکمیل آرزو پر وہ اپنی جھاگ میں،
ڈوب کر مر گئی،
بعد از وفات، میں اپنا بدن،
وحشی انسانوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتا تھا،
میں چاہتا تھا، میری نعش کو
جنگل میں چھوڑ دیا جائے تا کہ میری ماں شرمندہ نہ ہو،
وہاں کی بلیاں، مجھے لڑکیاں دکھائی پڑتی تھیں

آرام سے میری گود میں بیٹھ سکتی تھیں،

میرے پاس ان کو انسان بنانے کا اسم تھا

میں چکنی مٹی کو کھنکھناتی ٹھیکری میں بدل سکتا تھا

تم نے کبھی مٹی کی چکناہٹ چکھی ہے

سیفو نے چکھی تھی،

تب ہمارے بدن ایک ہوئے تھے،

کاش تم نے اس کی چھائیوں کی

مٹھاس چکھی ہوتی

خیال تو بے پیدائش چیز ہے

ایک خیال کے پھٹنے کو

دوامی پیدائش پر منطبق کیسے کریں

بے پیدائش......علت ہی یکتا ہے

سات سمندروں کی گہرائی سے

وقت کی گھپا میں گونجتا لفظ،

سایہ برآمد کرنے کی جستجو میں ہے جو

میری روح کو، اپنی آنکھوں سے کھینچتا ہے

میرے آنگن میں، شیشم کے پیڑ سے لپٹی

مُولسری، کھڑکھڑا کر ہنستی ہے اور کوئی

میری نیند کی چادر کھینچ کر

بھاگ جاتا ہے

اے پھاٹکو، اپنے سر بلند کرو،

بدی کے دروازے، اونچے کرلو،

یونان کی حسینہ کی آمد ہے،

بازگشت ہے،

میں اپنا رشوتوں والا، واہنا ہاتھ،

خوشی کی قربانی سے گذاروں گا

اس نے، میری محبت کے کرم سے

میرے پہاڑ کو قائم رکھا،

میرے ماتم کو ناچ سے بدل دیا،

اس نے میرا دکھ دیکھا لیا ہے،

وہ میری جان کی مصیبتوں سے واقف ہے

اب وہ میرے پاؤں، کشادہ جگہ میں رکھے گی

پھر اسکی پہلی نظر سے میں،

منور ہو جاؤں گا۔

ماہی گیر عورت کی بغلیں

مچھلی کی بو سے بھری ہیں،

گھنے بالوں میں انکی یا درخت کی

ٹہنیوں میں چھپی چیزیں،

ذائقے میں لذیز ہوتی ہیں،

ٹیلا سورج پر بھاری تھا

سفید، نارنجی سب نگل گیا،

قصبے کا سٹیشن مر گیا!

میرے خواب مجھ سے چند قدم آگے چلتے ہیں،

ان کے دونوں ہاتھوں میں، ہتھکڑیاں ہیں،

ان سے لپٹی زندگی کے پندرہ سال ہیں،

جن میں ٹرین ہمیشہ چھوٹ جاتی ہے

پلیٹ فارم پر بھاگتے، سانس سیدھی کرنے کو،

آدھی رات میں،

ٹیک لگا کر بیٹھنا پڑتا ہے،

آدمی جب اکیلا ہو تو آنکھیں،

کم جھپکتا ہے

ڈرٹی سیکرٹ اسے گھیرے ہوتے ہیں،

اخبار کی عمر بھلے ایک دن کی ہو،

اس کی خبریں برسوں زندہ رہتی ہیں

منحوس بددعاؤں کی طرح

کپڑوں سے زیادہ، تمہارا منہ کھل گیا ہے

چلو میں تمہیں، وہاں لے چلوں

جہاں میرے نام کی کافی بکتی ہے

ہینگ اوور کا سب سے بہتر علاج

کیا پتہ تمہیں، یہ کافی ہو،

خرِ عیسیٰ . بھاگ کر پہاڑوں پر چڑھ گیا تھا،

اس نے آدم اور مالتھس کی تھیوریاں

زمانہ قدیم ہی میں پڑھ لی تھیں

میں اسے جنگل میں دیکھ کر، حیران ہوا تھا،

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا

کہنے لگا مجھے جنگل کی چڑیلیں، بہت بھاتی ہیں

پھر وہ انعام میں پائی ایک عورت کو ساتھ لے آیا

جس کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا،

ریس سے پہلے اس نے گھوڑے کے کان میں کچھ بولا تھا

کہا تھا، اے دوست میرے پاؤں کو دیکھ،

باخبر گھوڑے کی روح قوی ہوتی ہے

بے روح تو دانش سے خالی ہوتا ہے

جو روح کے ساتھ متحد نہ ہوا،

وہ محض، عضو مردہ تھا،

جن طوطیوں کے لیئے،

وافر قند موجود ہو، وہ غذا سے آنکھیں

بند کر لیتی ہیں

کچھ قفل ایسے ہیں جو،

بے کھلے رہ گئے ہیں،

مغرب سے نکلنے والا، آفتاب نہیں ہوتا

جنگل کی عورت گھر لانے والا شخص،

اس سے پہلے کہ لوگ نوزائیدہ کی آواز سنتے

وہ گلی کی نحوست کو، جنگل کے اُسی درخت کے پار،

پھینک آیا، جہاں ایک حرامی پیدا ہوا تھا،

کچھ باتیں ہیں جو نہ کرنی اچھی ہیں،

ٹھوکر کی نوک ایڑھی سے نہیں مل سکتی

چھینی ہتھوڑا لے کر، دکھ کو،

نئے سرے، سے تراشنا ہوگا،

میری دوست کہتی ہے،

تمہارے پاس نقشہ ہے

بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ دیمک بنو

اپنے بغض کی سیلن میں چھپ جاؤ

جب انت ہوگا تو دیکھا جائے گا

مگر لاتعداد خاموش باتیں

اُمڈ اُمڈ کر گونجنے لگتی ہیں،

کہتی ہیں کوئی اپنی لکیروں سے،

بھاگ نہیں سکتا

فرشتوں کے بھاری بوٹ، بجنے لگتے ہیں،
میں نیکی اور بدی کے درمیان
لٹکے شخص سے روز ملتا ہوں
میرے ہاتھوں میں کچلے سروں کی مالا پروئی ہے
لوگ مجھے سروں کا بیعانہ دیتے ہیں،
میں بانجھ عورتوں کو، اولادِ نرینہ کے تعویز عطا کرتا ہوں،
میرے گرد سفید روشنی کا ہالہ ہے،
میں پتھریلے فرش پر،
مکوڑوں کی طرح چل سکتا ہوں،
میں کبھی واعظ نہیں کرتا مگر لوگ
میرے حضور اپنی حاجتیں بیان کرتے ہیں
جہاں دو اینٹیں آپس میں ملتی ہیں
میں ان کے درمیان اگ آیا ہوں
خاموشی کی ان درزوں میں،
میں اندھوں کی طرح پاؤں جمائے بیٹھا ہوں
میرے اطراف میں محبت کی فضا پھیلی ہے
مست خرام پرندے دھمال ڈالتے ہیں
لوگ خود اپنی پوجا کا مقام منتخب کرتے ہیں
وہ مقناطیس کا شکار ہوتے ہیں،

مڑے ہوئے چاند کو دیکھ کر
شکاری کتے، اپنی زنجیر کھا کر
بھونکنے لگتے ہیں
میں ان کی آوازوں کو
دل کے گرجے میں طلب کر کے،
ان کی نظمیں سنتا ہوں،
ان کی اکثر نظمیں،
ان کے پچھلے بالوں میں،
میڈھیوں کی صورت لٹکی ہوتی ہیں،
ان کے پاس اپنی موت کا نقشہ موجود ہے اور وہ
اپنے آخری 'مان' میں داخل ہو چکے ہیں،
میں ان کو دیکھ کر سیفو کو یاد کرتا ہوں،
اپنے ایام ماضیہ کا دودھ،
دایۂ خواب سے چکھ لیتا ہوں،
وہ سکارف کھول کر میرے گلے لگتی ہے،
وہ ساری برکت اور لعنت کی باتیں جو اس نے،
میرے سامنے رکھی تھیں،
مجھے بھول چکیں،
مجھے تو بس اس کے کوٹھے پر گذارے،
وہ دن یاد ہیں، جب میں نے

اس کے گوشت کی لرزش محسوس کی،

اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کی،

وہ میری آغوش میں کسمساری تھی،

اس کے ہونٹ، میرے ہونٹوں سے دور ہٹنے کی

سعی میں معروف تھے،

تیرے اندر کی پری نے،

احسان مندی کے طور پر،

سر کو جنبش دی تھی،

ساری مخالف سینائیں،

قریبی رشتہ دار،

استاد اور اس کے دوست جو

اپنی زندگی قربان کرنے پر تیار تھے،

غم سے نڈھال ہو کر،

اپنی طاقت کھو بیٹھے،

میری داہنی آنکھ کا اندھ، اس وقت

تمام اندریوں کا حاکم و ناظر بن گیا تھا،

جس طرح واسنا سے،

صورتیں یا نقشے پیدا ہوتے ہیں،

وہ یاد کی ہوئی صورت، سامنے محسوس ہونے لگی

میں نے سانس کو باہر نکال کر،

وہیں پھینک دیا،

کوتاہ عقل انسانوں نے اپنی انگلیاں

ناک کے سوراخ بند کرنے میں لگا دیں

میں نے ایک یوگی تھا،

یوگی اپنے مذہب کی،

ظاہری نمائش، رسم ورواج کی پراہ نہیں کرتا

وہ تو جسم سے آگے نکل کر

رموز روحانی کی تلاش میں نکل جاتا ہے،

میں نے اس کی محبت میں،

ہوا پر اڑنا سیکھ لیا تھا،

صدیوں زندہ رہنے کی طاقت پالی،

میں جب چاہتا، صدیوں کے لئے

نظروں سے غائب رہ سکتا تھا،

اس کوٹھے سے میں نے طویل العمری کا راز پایا!

جہاں،

وہ کہتی تھی، اے میری دوشیزگی،

تو چھوڑ کر مجھے، کہاں چھپ گئی

وہاں گجرے کے ڈھلتے ہی، رات کا

تڑکا ہو جاتا تھا،

ایک خواب ختم اور دوسرا موخر کر دیا جاتا

چاند کے گرد، تاروں کی بزم،
ماند پڑ جاتی
منقش کی چادریں سمیٹ دی جاتیں
چاند کا زرد مرمریں بجرہ،
قلزم نیل گوں میں ڈوب جاتا
مجھ کو تو وہ، ملکہ ترشیلا تھی،
دولت کی دیوی، جس نام محبت ہے
طویل العمری کا راز ہے،
وہ مجھے یونان کی چوٹیوں پر،
بیٹھی دکھائی پڑتی ہے۔
اس کی انگلیاں، بہت خوبصورت اور فیاض تھیں،
اس کے بال سیاہ اور نرم تھے
وہ سچے موتیوں کی مالائیں پہنے،
کلائیوں میں سونے کے کڑے سجائے
میرے لیئے......
کانوں میں کندھوں تک لٹکتے، سونے کے بالے
بالوں میں کنول کے پھول اڑس لیتی تھی
اس پر تازہ پھولوں کے گجرے،
آسمان سے اترتے تھے جن سے
کائنات مہک جاتی تھی۔

اس کے آنگن میں، شفاف پانی سے بھرا،
شاندار اور چمکتا ہوا کلس تھا،
جس پر دل کوش ہوتا تھا،
یہ علامت تھی کہ میری ملکہ کو، کسی گناہ گار نے نہیں چھوڑا
میری شیلا،
جب معبروں کو طلب کر کے، اپنے خوابوں میں میرا ذکر کرتی تو
وہ اسے بتاتے کہ اُسے ایک ایسا عاشق
میسّر ہے جو رہتی دنیا تک تیری مجلسوں کو کاغذوں میں
اور تیری صورت کو اپنے دل میں زندہ رکھے گا
میں آج بھی ایک بچے کا روپ دھارن کرتا ہوں
مہنت کا بیٹا بن کر،
سکول کی چھٹیوں میں، گائیڈ بن کر چلتا ہوں،
اس منزل تک، جہاں مغنیہ کا کوٹھا سجتا تھا،
جہاں وہ خود سج کر بیٹھا کرتی تھی،
لوگ لڑکے سے پوچھتے ہیں،
کیا تم واقعی اس قصّے کو مانتے ہو، تو میں
جواب نہیں دیتا، کندھے اچکا کر،
کہیں اور دیکھنے لگتا ہوں
یونان کی سڑکوں پر، آج بھی
طوائفیں نظر آتی ہیں،

وہ میری آمد کے آثار کی منتظر رہتی ہیں،

کہتی ہیں، شائد وہ آگیا ہے

پھر للچائی آواز میں کہتی ہیں،

چلو ہمیں اپنی گاڑی میں لے چلو

تمہی نے ہماری دیوی کو زندہ رکھا ہے،

شائد ہم بھی چند برس جی سکیں

محبت نے، مجھے نائب کے مرتبے پر فائز کر دیا ہے

تم قدیم ایام کو یاد کرو،

نسل در نسل کے برسوں پر غور کرو،

اپنے باپوں سے پوچھو، وہ تمہیں بتائیں گے

محبت کے تمام قصے، میری محبت کی نقل ہیں،

میں سب سے قدیم عشق ہوں،

سب سے قدیم نغمہ گر کی یاد،

جسے وہ صدیوں کے لیئے زندہ چھوڑ گئی۔

تم نہیں جانتے،

دوئی کا علم پراگیہ ہوتا ہے نہ تریہ لیکن

پراگیہ تو کارن کا بندھ ہے

حقیقت کا نہ جاننا، نیند ہے،

تم نیند میں ہو، اور میں جاگ رہا ہوں،

تم جن چیزوں کو دیکھتے ہو،

اس درخت کی مانند ہیں جو تمہیں سیدھا نظر آتا ہے،،

حقیقت کی کھوج کرو تو جان لوگے کہ

پانی میں الٹا دکھائی دینے والا عکس،،

ایک دن سیکھا ہو کر، آج کو الٹے میں،،

بدل دے گا۔۔

تم بھی میری کہانی کو سیدھا پڑھتے ہو،،

یہ تو محض بازگشت ہے،

ہماری کہانی، جس کو تم نے، دفنا رکھا ہے،،

الٹی ہو کر ایک بار پھر سیدھی نظر آئے گی

ریگستان میں پانی نہیں ہوتا،

تم اکشروں کے عظیم جوڑ کو،

غور سے پڑھو،

ہمیشہ قائم رہنے والی آواز سنو،

سیفو کی آواز سنو،

میں اکثر ان رشیوں سے ملتا ہوں جو

بسبب فرشتوں سے بڑھتے ہوئے ہیں

ہیولے مادہ اور روحانی حقائق کے درمیان لٹکے ہیں

ایجاد کرنے کو برہما سے نسبت ہے،

نارائن تو طبیعت کا فضل ہے،

طبیعتیں ہر لمحے، کدو کاوش کرتی ہیں،

سیفو تو، زوس کی بیٹی تھی،

حیوان خصلت، اس کو کھانا چاہتا تھا،

اس کی ماں نے آگے بڑھ کر،

ایک پتھر اس کے منہ میں ٹھونس دیا تھا،

وہ چاہتا تھا، اس کے خوشبو سے مہکتے بال

دیوتاؤں کے کام آئیں

زحل ہی ازلی ہے،

ازل سے ایک حال پر باقی ہے

ارا طس نے شاعری کو دیوتاؤں کے نام سے

شروع کرنے کی مخالفت کی،

اس کو اور مبہم کر دیا کہ فلک کے نام سے

ابتدا کریں،

زوس تو ہمارے نفوس سے مشابہہ،

ہیولیٰ میں پھیلی روح تھی،

وہ بھی قصے، جنہوں نے اسے مہربان اور

نیکیوں کی علت کہا،

مونڈھوں اور ہاتھوں سے پیدا ہونے والے،

پیروں سے پیدا ہونے والوں کے،

مطیع ہو چکے،
یہ ذلیل لوگ ہیں جن کا شمار
کسی طبقے میں نہیں ہوتا
وہ انہیں ہاڈی، ڈوم اور چنڈال سمجھتے ہیں،
ان کی حالت، اولادِ زنا کی طرح ہے،
ان کے باپ شودر اور مائیں برہمنی تھی،
دونوں کی حرامکاری سے پیدا ہوئے لوگ
ایوانوں پر قابض ہیں،
وہ جنہیں برہما نے برابر پیدا کیا،
کتابیں جن کا رونا روتی ہیں،
یہ سب معمولی ہیں، بدھتو ہیں،
کتا تک کھا جاتے ہیں۔
استحصال کی قوت سے مالا مال یہ لوگ
خصی ہیں،
ان کی عورتیں، کوڑوں اور پانڈوؤں کے پاس جاتی ہیں کہ
نجیب بچہ پیدا کر سکیں۔
بعض تو یہ معلوم بھی نہیں کر پاتیں کہ انہوں نے
کس کا بچہ جنا ہے،
قیافہ شناس ان کے مددگار ہوتے ہیں،
شہرِ قدیم میں،

ہمارے آدت پر، سرخ رنگ کی
کھال منڈھی تھی،
بدن لکڑی کا اور آنکھیں یاقوت کی،
اس بات کو
دو لاکھ سولہ ہزار، چار سو بتیس برس گذر گئے،
ایک مقام پر میں نے برہما کو دیکھا،
اس کے چاروں طرف منہہ تھے
ہاتھ میں ایک گھڑا تھا،
بیذ برہما کے منہہ سے نکلا ایک لفظ تھا
آدت کی نسل، اسکا مطلب سمجھے بغیر
اس کی تلاوت کرتی تھی،
ان میں بعض بیذ ایسے تھے، جنہیں عمارتوں کے اندر پڑھنا
جائز نہیں تھا،
ان سے خوف تھا کہ اس سے،
جانوروں اور عورتوں کا حمل، ساقط ہو جائے گا
ایک شری ہریش تھا، جو
زمین میں غور کر کے
ساتویں زمین تک کے خزانے، ذخیرے
دیکھ لیتا تھا، نکال لیتا تھا،
منجموں کی تاریخ کئی سال آگے نکل گئی

اس جنگل سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ

ادھر لوٹ جائے، جدھر سے داخل ہوا تھا،

کنگ نے سوار ہو کر، ایک نشیبی زمین کے گرد

گھوڑا دوڑایا، پھر اس کے بیچ،

اپنا نیزہ گاڑ دیا،

ہمارا کنگ طبیعت میں آفتاب، آتشی اور

بذات خود روشن تھا، وہ جب بھی

کسی دوسرے ستارے کے سامنے آتا،

اس کو عارضی طور پر روشن کر دیتا تھا،

سب ستارے، کروی شکل، آبی طبیعت اور بے نور تھے

ان میں سے بعض

حققت میں ستارے نہیں بلکہ ثواب پانے والوں کے انوار تھے

ان کی مجلسیں، آسمان کی بلندی میں،

بلوری کرسیوں پر تھیں،

ماہتاب تو ہمیشہ، آفتاب کے نیچے رہتا تھا،

عشق کی مثال تو، اس اژدھے کی تھی، جو

سب کرموں کو نگل جاتا ہے،

میرے دشمن، سیفو کا ذکر آنے پر، میری آنکھیوں کو

جادو سے سی دیتے تھے اور کہتے تھے،

گوہر دو عالم خرید لو، اس طفل جاہل سے کہ وہ گدھا ہے

گدھوں کا کوئی گوشوارہ نہیں ہوتا،

ان کا گوش اور ہوش صرف سبزہ زار ہے

تقویم ان کی فکر سے خارج ہے،

اگر میں کچھ کہوں تو میں بھی جل جاؤں گا،

سننے والا بھی جل جائے گا،

استخوان اور ہوا، روپوش ہے، اور بس،

دونوں عالم میں، اس کے سوا کچھ بھی نہیں،

میں تو زر سرخ ہوں، جس کا رنگ

سیاہ پڑ گیا ہے۔

بت پرست کی یہی سزا ہے کہ اس کی جھولی

اطلس کی، اور گھوڑا لکڑی کا ہوتا ہے

اس کوٹھے پر، دیووں کی رنڈیاں،

دلفریب گیتوں اور دلکش سازوں میں

دائمی سرور کے ساتھ، آمدورفت کرتی رہتی ہیں

کسی زمانے میں میرا مشتری، یہاں رہتا تھا،

میں نے اس کی ہزاروں تصویریں بنائیں،

اس کے لیے، جو کچھ واجب تھا، پڑھا کیا

گلاب، جو اور تیل کو آگ میں ڈال کر

ان کو راضی کرتا رہا۔

آگ کے چاروں طرف

جواہرات، شیریں پانی، پھلوں، درختوں کی شاخوں
اور نباتات کی جڑیں بچا تار ہا
ہنسوے سے کٹی گھاس، بچھائی، مختلف قسم کے بیج
جمع کر کے، ان کے درمیان سونا رکھا،
ان سب کو، ایک گھڑے میں ڈال کر،
سیفو کا ہوم کیا،
میرا منہ شہر کی طرف تھا اور پشت گاؤں کی طرف
اس نے جان لیا کہ میری وفا کے لیئے، میرا رخ ہی کافی ہے،

جھونپڑی میں نیند کا سامراج چھا گیا ہے
کنجڑوں کی ٹولی، بدن میں کلیجی سمیٹ کر،
سارے ٹھگی پن بھول گئی ہے
لڑکی،
پرانے جاپانی گراموفون پر
کملا جھریا کا گیت سنتی ہے
ادا سے آیا کرو، پنگھٹ پر،
جب تک رہے جگر میں دم
میری آنکھیں نیند سے سڑ گئی ہیں،
جو آنکھیں تم کو، نگاہ میں نہیں رکھ سکتیں،

میں ان کو کیچڑ میں دفن کرنے جاتا ہوں،
میری ایک آنکھ، میرے سر پر رکھے
طشت پر ہے، جس میں تمہارا
سر رکھا ہے،
جب تک یہ سر، تمہاری گردن پر تھا،
میرے سر کا تاج تھا،
میں نے تمہارا بدن، دھڑ سے کاٹ ڈالا
صرف یہ دیکھنے کے لیئے کہ اس کا حساب
کون لیتا ہے،
پتھر گھسیٹتے، میری عمر گذر گئی ہے
پھولی ہوئی سانس کو، ایک دن تو
شکست پانی ہی تھی،
سینکڑوں سال میں اپنا سینہ
کھول کر بیٹھا رہا،
کوئی تو آگ پھینکے، کوئی خنجر اتارے،
مگر پڑھے لکھے لوگوں کی منڈلی،
اخباروں کی ہیڈ لائن پر تبصرے کرتی رہتی تھی،
گیان سے عاری جماعت، آدمی کی مرمت کرتی تھی
گیان تو بیداری کی حالت میں،
آنکھ میں قیام کرتا ہے، یہی تو آتما ہے

یہی لافانی، بے خوف برہم ہے،

جسم کیشف ہے،

اندھا، بہرا ہونے سے ناقص نہیں ہوتا،

نہ ہی اس کی ہلاکت ہوتی ہے

جس طرح گھوڑا، اپنے بالوں کو جھاڑتا ہے

جسم بھی پھٹ کر، برہم لوک میں مل جاتا ہے

وہاں......

بازگشت نہیں ہوتی

خدا کی خدمائیں بھی، مندروں سے وابستہ ہیں۔

دیوداسوں کا الہامی سلسلہ موجود ہے،

یہ خادمائیں، درحقیقت بیسوائیں ہیں،

یہ مقدس دستے، دیوی دیوتاؤں کے روبرو،

گاتی ہیں، ناچتی ہیں، اپنے اپنے برہموں کو

خوش کرتی ہیں۔

ان کے گانے فحش اور حرکات وسکنات

شہوت انگیز ہیں۔

دیوتاؤں کی شہوانی توصیف کرتی ہیں،

جنسی اعضا اور تولیدی علامات کی،

پرستش کرتی ہیں،

بھیڑیے رت جگا کرتے ہیں،

خوش آواز، خوش پوش، دوشیزائیں،
ان کے سرہانے پنکھا جھلتی ہیں،
گیلی زمین میں، آتش سرخ،
زندگی دینے والی ہوا، مقدس ارواح
جب چاہیں، جنم لے لیں،
ان کا ریشہ جہاں تک چاہے پھیل جائے
مگر عورتیں تو، سمندر کی لہروں کی طرح
بے ثبات ہوتی ہیں،
رنڈی کی چاہت بھی آوارہ ہوتی ہے،
وہ بادلوں پر سورج بن کر چمکتی رہتی ہے،
پورے ذود شوق سے، آدمی سے
چمٹ جاتی ہے، اسے نچوڑ کر چھوڑتی ہے،
مچھلی پانی میں پیاسی کیسے رہ سکتی ہے،
مسافروں کے لیئے کوئی راستہ نہیں،
ان کی روح پیاسی ہے،
خالی جگہ میں کچھ نہیں ہوتا،
میں نے ایسی ساری خالی جگہیں،
مجسموں سے بھر دی ہیں،
ایسی برجستہ سنگ تراشی کی ہے کہ
میرے مجسمے کسی کو نظر نہیں آتے،

میں نے یونان کے ہر پہاڑ پر ایک مجسمہ تراشا ہے

جو لافانی ہے

کس نے قبل مسیح سے آجتک محبت نبھائی ہے

میری ابتدا و انتہا، محض خواب ہے

موت مجھے چھو نہیں سکتی

میں اپنی سیفو کی بازگشت ہوں

میرے بوسوں کا سبب بارش ہے

بارش کی اصل پانی میں، موسموں میں

جانوروں اور اندرریوں میں ہے

میرے پانچ بھگتی روپ سب سام ہیں

میں زمین کو پہلی سیڑھی مان کر

تقدیم کے اعتبار سے اوپر چڑھتا چلا جاتا ہوں

حتی کہ وہ چھت آجاتی ہے، جہاں بیٹھ کر

میں اس کی شاعری سنتا تھا

ایشور کے بھی دو نام ہیں

سیفو کے بھی دو نام ہیں اور مجھے

دونوں سے محبت ہے

اسکی نہر میں جڑی

کاشی کی ٹائلوں کا رنگ
سبز اور سفید تھا جن کے کنارے
لمبے سیاہ پراہنوں میں چھپتے چہرے
لوگ تلاش کرتے تھے
آسمان کی نیلی زمین پر، پتنگوں کے پر اور
دُموں کے سرخ اور سبز رنگ کھلتے تھے
پتنگ آسمان میں چڑھتی تو اس کے پر اور دموں کی
تکی جھالریں آسمان میں گم ہو جاتیں،
فقط پتنگ کا سینہ دکھائی دیتا،
باہر کے موسموں کا ہجوم،
قد آدم آئنوں میں،
لا انتہا منعکس دکھائی دیتا
اندر بیٹھی عورتوں کو دیمک چاٹ گئی تھی
جب وہ گھر کی پچھلی سیڑھیوں پر سے اترتی
تو ہم سفید گھوڑوں والی منتظر بگھی میں بیٹھ جاتے
لوگ سڑک کے دونوں کناروں،
نہر اور درختوں کے پیچھے کھڑے ہوتے
اس کی زمردی شال کے اوپر
تین بڑے قدحے، برف سے بھرے رکھے ہوتے
جن میں گلاب پاش، چار گلدانوں کی صورت

شمال کے چاروں کونوں پر رکھے جاتے

جب سویرا ہو رہا ہوتا تو ہم واپس گھر پہنچتے

پگھلے ہوئے سیسے جیسی سرد روشنی

کہرے سے پھوٹ کر نکل رہی ہوتی

ایک زردی مائل اجالا، کہیں سے نکل کر

مکان کے اندر، سکون اور خاموشی سے لپٹ جاتا

پر سکوت شہر کی، ایک ادھ کھلی کھڑکی

پالے سے دھندلی پڑی' کھڑکی کے شیشوں میں

ایک مکان کا ادھ مٹا سایہ،

میرے اردگرد کی ہر پہلے جیسی چیز میں

سفید سایہ، بڑھتے ہوئے چاند دھوئیں کی طرح

گھلنے لگتا،

برف کی موٹی تہوں سے پانی دوبارہ

زندہ ہو کر، نالیوں میں بہہ نکلتا،

صبح کی روشنی، آخرکار رات کا محاصرہ

توڑ دیتی

ابتدائی سرسراہٹیں، تند بہاؤ کے شور میں

بدلنا شروع ہو جاتیں،

ہر رات برف میں دبے رہنے کے بعد

سورج زندگی کی واپسی کا اعلان کرتا

وہ میرے لبوں پر ایک طویل بوسا دیتی اور کہتی

کل دوسرا پہر شروع ہونے سے پہلے آجانا

رخصت ہوتے ہوئے، سیڑھیوں پر

میرے قدم بوجھل اور غیر متوازن ہوجاتے

عالم کے جمادات و متحرکات

دیوتاؤں سے پیدا ہوتے ہیں،

رشیوں سے پیدا ہوئے پتروں کو،

چاندی یا چاندی پتے برتنوں میں پیش کرنے سے

بے حساب برکت پیدا ہوتی ہے

اس کے باپ نے، پورے ذہنی ارتکاز کے ساتھ

خاموش اور مطمئن ہوکر، جنوب رخ

برکت طلب کی تھی،

اسکا عقیدہ سلامت تھا،

وہ چاہتا تھا، دانا لوگ اس کی اولاد کے ساتھ رہیں،

ان کے دیدوں کے سبب ان کے علم اور اولاد میں ترقی ہو،

سو، اس کی بیٹی

ائیولی بولی میں، متنوع بحروں میں لکھتی تھی،

میری محبت سفوکی استرہ سے تھی،

اس کی شاعری، محدود مگر گہری ہے،،

اس کا دارومدار (میں) عشق ہے،

وہ کہتی تھی، آ کے میر نے بربط پہ

فن کی بولتی، جیتی جاگتی شے بن!!!

اس کا پنڈا تمام سوز دروں سے عرق عرق ہو کر کہتا تا

پیا ہم سے، سیاں ہم سے، انوکھی کون سی نار؟؟

یہ محبت ہی تو ہونے کی وہ حالت ہے،،

اب تمہارا واسطہ کسی دوسرے سے نہیں،

یہ نفرت بھی، الٹ گئی محبت ہے.

یہ متضاد نہیں، انسان محبت میں

گم ہو جاتا ہے۔ تنہائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

میں، دن کے ایک ایک لمحے میں، تم سے

تعلق قائم رکھتا ہوں،

زمین پر چلتا ہوں تو ایک جگہ تمہارے پاؤں ہیں

دوسری جگہ میرے

زمین نے ہم کو جوڑ رکھا ہے

محبت وہ عاجز مٹی ہے جس میں،

کوئی رنگ نہیں ہوتا،

یہ پھول رنگ کہاں سے پاتے ہیں،

انمیں ریشمی گلاب، کہاں سے آتے ہیں،

مٹی سبزہ نہیں ہوتی، پھر ہرے درخت نکل آتے ہیں،
زمین کے ہر چپے پر بیٹھے لوگ، آپس میں
محبت اور کشش کی ڈور سے بندھے ہیں،
چاند نکلتا ہے تو نوجوان لڑکیاں
ایک حلقہ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں،
محراب ہیکل کے گرد

میں جب بھی وہ میوز گاتا ہوں
جو وہ میرے لیئے گاتی تھی تو ایک
نوخیز لڑکی، بستر سے چھلانگ مار کر
اٹھ کھڑی ہوتی ہے،
کھڑکی میں کھڑی ہو کر، ہاتھ کان پر رکھے
سننے کی منتظر ہے،
میں نے اس کو ماضی کی وہ جیتی جاگتی
توانائی بخش دی ہے، جو صدیوں پرانے بچپن میں
پائی جاتی تھی،
وہ عورت جو کسی زمانے میں، میرے ساتھ رہتی تھی،
درسگاہ کی مالک تھی کہ کوٹھے کی،
اتنے قدیم زمانے کی یادداشتوں میں

چیزیں گڈمڈ ہو گئی ہیں، پھر بھی،

مجھے اچھی طرح یاد ہے، شاعری، موسیقی،

اعضا کی شاعری سے جڑی ہے،

مٹی لین کی موسیقار شاعرہ ہو کہ

کریلس کی کبی

رقص اعضا میں یکتا

دونوں کو کون بھول سکتا ہے

جیتے زمانوں سے وہ ایک دوسرے کی باز گشت میں،

میرا اور سیفو کا مذہب، سامی تھا،

ہم سام کی اپاسنائیں کرتے تھے

لوگ، اس کے سروں میں، بھلائی کا ماخذ

تلاش کرتے تھے،

روحانی نیکیاں اس کی طرف کھینچ کھینچ کر آتی تھیں

سام دیدیوں کا دین ایمان سام گانا تھا

سارا دھیائے اسی سے بھرا پڑا ہے

اس کے پاس پانچوں بھکتیاں تھیں

جب وہ اپاسنا کرتی تو

لوگوں کے چڑھتے ہوئے اور اترتے ہوئے

بھوگ لکھے جاتے،

اس کی راگ اپاسنا سے ہوا یعنی پُروا چلتی،

ابر آجاتے اور منہ برستا،

پھر پرستاروں کی ساعت میں بجلی چمکتی اور

رعد گرجتی،

اسکی اپاسنا، مینہ برساسکتی تھی،

دلوں پر محبت اور داسنا کی بارش

اس بارش کا پرساد، پیار کی وہ ندیاں تھیں

جو میری طرف بہتی تھیں،

اس سے میرے اندر ایک دریا چڑھتا تھا،

میرے وجود کو سیراب کرنے سے زندگی

میرے اندر بہ افراط بہتی تھا،

پانی کبھی نہیں مرتا،

اس کی اپاسنا، مرگئی مگر میں اب تک

اس کی دی ہوئی زندگی جی رہا ہوں۔

اس اپاسنا کی گونج، میرے اندر بہتی ہے،

تم اگر سروں کو سن سکتے ہو تو سر جو

تلفظ، الفاظ اور دھیان سے متعلق ہیں،

دھیان میں رکھ کر، دیوتا کے طلوع ہوتے ہی

میرے کنارے بیٹھ کر غور سے سنو،

اب میں ہی سام دیوتا ہوں،

میرے ساتھ سروں میں گا کر، مراد کو دھیان میں رکھو

مغربی رُخ، شہد کی نالیاں ہیں،

سام مکھیاں ہیں،

سام وید پھول ہیں، پانی امرت رس،

میری شمالی شعاعیں،

شمالی رخ، شہد کی نالیاں ہیں،

اتھر وانگی رس مکھیاں

پوران پھول ہیں، پانی امرت رس ہے

میں ارتقا کے دور سے گذر رہا ہوں

جب میں مشرق سے نکل کر، مغرب میں ڈوبوں گا،

مجھے وسوں پر خودمختاری کے ساتھ راج ملے گا،

مجھے یقین ہے کہ منزل پر قدم رکھنے سے پہلے

میرے ہاتھ میں، اس کا ہاتھ ضرور ہوگا۔

غور سے اس کی آواز سنو، اس نے یہ گیت

میرے لیئے گایا تھا،

تم آگئے۔

میں کیسے شکریہ ادا کروں،

یہ بے صبرا دل کب سے بے قرار تھا۔

میرا شعلۂ شوق، تابناک تھا،

ہوا نے بڑھکا کے اسے،

کو ہ نار میں تبدیل کریا،

تیری قربت جمال میں،

ایک عجیب سی آگ ہے،

جیسے شرار بافتہ حریر سنگ

یہ انعکاش تو التہاب ہے

یہ احتراز تو اضطراب ہے،

میرے لبوں پہ تیری، خوش آمد کا ترانہ

مختصر عہد کے لیے بہہ نکلا ہے،

کتنا طویل تھا، زمانہ ترے ہجر کا

مگر میں لوٹا دوں گی یہ انتظار تجھ کو

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہ آنے والی صدیوں تک

میرے ہونے کی، میری محبت کی

بازگشت زندہ رہے گی

جب مجھ پر اسکی یاد سوار ہوتی ہے تو

میں اپنی جلد اٹھا کر، ہر جگہ سے،

پھاڑتا رہتا ہوں،

اپنی ہی چوریوں کو، جنھیں کسی نے نہیں دیکھا،

زنجیر سے بندھی، نظمیں بھونکتا ہوں

اس کے قلم میں

سرخ سیاہی لگا کر

پریم کوتیائیں لکھتا ہوں،

میرے تصور میں، اب ایک اندھیرا بس گیا ہے،
جس میں میری آنکھیں روتی ہیں
میری تکمیل سے پہلے، اندھیرے کا مہاجن
میری زندگی کے کھیت پر قابض ہو گیا ہے
ہر رات میرا ایمان کرتا ہے،
تلسی کے پتے بھی کسی کام نہیں آتے،
سلیٹی ریگستانی اونٹ کے پیٹ میں
پانی ابلتا ہے،
کوئی سمندر کا پراکر کیسر،
چرا کر لے گیا ہے،
چمکدار سیاہ بلی، روشن آنکھوں سے
مجھے گھورتی رہتی ہے،
اس سے پہلے کہ میں اس کو پکڑ پاؤں
کوئی اسکی گردن مروڑ دیتا ہے،
میری کہانی حیرت زدہ ہو کر، ٹھہر جاتی ہے،
بلی دوڑنے لگتی ہے،
میرے تکیئے پر 'چڑیا' لکھا ہے
لیکن کپاس کے پیڑ پر،
چڑیا نہیں بیٹھتی، بلیاں روتی ہیں،
مارا جائے گا ایک روز،

نیند کا راجہ، میرے ہاتھوں،

اور میں رکھ دوں گا ایک اور یاد

مٹی میں ڈھانپ ڈھونپ کر

بلی، پوری طرح سے زندہ،

خوفزدہ ہو کر، دروازے پر بیٹھی،

غراتی ہے، جسے میں،

اپنے ساتھ کمرے میں، کسی عزیز کی میت رکھے

سوگ میں جاگ رہا ہوں،

موت کے قطع کیے، اس وقت کے گزرتے ہی،

ہم پھر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں،

جب میری تنہائی،

رات سے زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہے،

میری یادیں،

تھکن اور دیوانگی سے لبالب بھر جاتی ہیں،

میں کھڑکی کا شیشہ توڑ کر،

یونان کی گلیوں میں نکل جاتا ہوں،

کہرا مجھے گھیر لیتا ہے،

میرا خون جم جاتا ہے،

پہاڑی سبزہ زاروں کے چشمے جم جاتے ہیں،

گلی گلی میں میرا واعظ سننے کو

لوگ جوق در جوق جمع ہوتے ہیں،
میں نے محبت کو سیڑھی بنا کر،
قادر مطلق سے رشتہ استوار کرلیا ہے
سالخوردہ اور عمر رسیدہ لوگ
حکمت نہیں سکھا سکتے
جب لوگ الفاظ کی تلاش میں ہوتے
میں ان کی دلیلوں کا منتظر رہتا،
وہ حیران ہوتے کہ ان کے پاس
کہنے کو کوئی بات نہیں ہوتی تھی،
میری رائے سند تھی کیونکہ
میں باتوں سے بھرا تھا
میرا پیٹ بے نکاس شراب کی مانند تھا
وہ نئی مشکوں کی طرح پھٹنے کو تیار رہتا
میں بولتا تا کہ مجھے تسکین رہے
میری زبان، میرے منہ میں سخن آرائی کرتی،
میری محبت کی راستبازی کو ظاہر کرتی،
میرا رعب کسی کو ہراساں نہیں کرتا،
خواب میں، رات کی رویا میں،
جب لوگوں کو گہری نیند آجاتی۔
تب میری باتیں، ان کے کان کھولتیں،

میں ان کی جان کو گڑھے سے بچاتا

ان کا گوشت سوکھ جاتا اور ان کی

دکھائی نہ دینے والی ہڈیاں، نکل آتیں،

جیسے زبان کھانے کو چکھتی ہے،

کان باتوں کو پرکھتے ہیں،

میری روح آج بھی اسی مکان میں بستی ہے،

اگر یہ روح اپنے دم کو واپس لے لے،

تو تمام بشر فناہ ہو جائیں گے،

یونان مٹی میں مل جائے گا

انسان مٹی میں مل جائے گا

لوگ بلائے جاتے اور گذر جاتے ہیں،

کچھ لوگ اتنی پرانی باتیں سن کر

اپنے گناہوں پر بغاوت کو بڑھاتے ہیں،

ہمارے درمیان، تالیاں بجاتے ہیں،

وہ آج بھی، ہر رات، مجھے،

نغمے عنائت کرتی ہے، جس پر چلنے والے

بیڑیوں میں جکڑے جائیں گے،

معصیت کی رسیوں سے باندھے جائیں گے

انہیں کیا معلوم، ایک ہفتے،

راستوں پر برف، جھالوں کی شکل گزرتی رہی

لوگ گھروں سے،

کھڑکیوں کے راستے باہر نکل سکتے تھے

کتے، اصطبلوں کی اوپر ہی، منزل پر

بھونکتے تھے،

ان دونوں میں اس نے مجھے، خشک گوشت اور

بچی کچھی چیزیوں پر زندہ رکھا،

کالی صدائیں، پیلے دانتوں سے

دہشت زدہ کرتی تھیں

ساری رات ہوا

کھڑکیاں دھڑ دھڑاتی رہی،

دالان میں بلیاں روتی تھیں

چھت سے لٹکی رسی، ہل ہل کر

توجہ کو اچک لیتی تھی

ایک سرد خالی پن کا احساس،

بستر کی چادر میں لپٹا مرے ساتھ جاگتا تھا

باہر سے اترتی ہوئی ٹھنڈ نے

کمبل کے بوجھ تلے، مجھے بے حرکت کر دیا،

دیواروں سے چمٹے کہرے نے برفانی سیلن کی چادر سے

پورے ماحول کو ڈھک کر،

قدموں کے تمام تازہ نشان مٹا ڈالے تھے

میرے پاس اس کی وہ تصویر تھی جس میں

ہم دونوں، بادشاہ کی گذرگاہ پر کھڑے

اس عمارت کو، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے

دیکھ رہے تھے، جس میں اسکا سکول تھا

یہ تصویر بہت پرانی تھی، جس میں ایک

کہنگی اتر آئی تھی

اسے اس کے ایک عاشق نے بنایا تھا

جس میں وہ انتہائی خوش شکل اور خوش لباس نظر آتی تھی،

میرے چہرے پر اس نے رنگوں کی آمیزش خلط کر دی تھی،

میں نے پھر بھی تصویر کو، لکڑی کے فریم میں لگا کر،

اپنے گھر کی بڑی دیوار پر نصب کر لیا تھا،

پھر جیسے رفتہ رفتہ میں اسکا عادی ہو گیا،

اس نے میری جانب دیکھنا چھوڑ دیا،

اس جنم میں، میں، جب وہ تصویر دیکھتا ہوں تو

میری جگہ، مجھے، وہ مصور نظر آتا ہے، جو

اس کا ہاتھ تھامے، مجھے گھورتا ہے

اس کے الفاظ آتشیں،

سوز اور تپش سے بھرے،

ایک مقدس اضطراب میں لپٹے،،

اس کے دل کو ایک آتش کدہ بنائے رہتے،،

وہ محبت کا، دل چیر دینے والا نغمہ

میوز کی نفی سے کرتی،،

ہر روز اس میں، ایجاد و اختراع سے کام لیتی،،

ایک روز وہ بیس تاروں والا بربط۔

ایجاد کر لائی، حالانکہ۔

اسکی شاعری، یونانی مذہب کی عکاس تھی،،

لیکن اس کے ترجمان، اس میں،،

اپنے دل کی آگ بڑھا دیتے جس سے انہوں نے۔

اس کے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش عام ہوئی،

اس کی گہری شاعری کی نظمیں،،

مختصر مگر گلاب کے پھول تھیں

مجھے لگتا ہے، اس نے ساری نظمیں،

میرے لیئے لکھیں اور اب

تصویر کے چھوکھٹے میں بیٹھی، رویا کرتی ہے

میں اپنے فالتو قصے، جیب میں ڈال کر

ایسے دوستوں میں بانٹا ہوں، جنہوں نے یونان کے کوٹھوں پر

کبھی کبوتروں کی بیٹ بھی نہیں دیکھی

وہ اس گلی میں جھانکے بغیر، بے وجہ اس کو

بدنام کرتے ہیں، ان کے اپنے گھروں میں دھوپ کبھی نہیں آتی
ان کے کواٹروں سے کھانسی کی آوازیں اٹھتی ہیں،
جہاں ان کی بوڑھی عورتیں بچے،
کھانا کھا کر اندھے ہو جاتے ہیں،
ان کی کھڑکیاں، لاغر مریضوں کی طرح
بند رہتی ہیں،
وہ اپنے دروازوں کی حفاظت نہیں کر سکتے
ان کی جوان لڑکیاں اندھیرے پکڑتی ہیں
میرے دوست اندیکھے زمانوں پر
فرضی بخششیں کرتے ہیں،
ان کے کمرے روز قتل کیے جاتے ہیں،
جن میں......
پھول اور گوشت کا فرق مٹ جاتا ہے
چیزیں ان کے ہاتھوں سے نکل کر
دیواروں کے قواعد میں شامل ہو گئی ہیں
ایک عہد قدیم کی عورت، ایک بوڑھے کو
جھنڈے کی طرح،
اڑانے لگتی ہے، لوگوں کو اپنے نغموں میں
ہریالی دور کے قصے سناتی ہے،
لوگ اس سُریلی آواز میں بندھ کر

اپنی دیواروں کے غم بھول جاتے ہیں،

قدیم عورت کی جانگھوں میں جا گھستے ہیں

جس میں لوچ ہے، نرمی ہے،

جہاں بے شرمی، ان وحشیوں کو

پالتو بنا دیتی ہے

تمام مسکراہٹیں دقیانوسی ہو چکی ہیں

گھنٹیوں کا غلغلہ بلند ہوتے ہی،

تمام ابابیلیں، پھر سے اڑ جاتی ہیں،

موسیقی کی لے، طنبورون اور گھڑیالوں کی لہک

پینترے بدل کر، دم توڑ دیتی ہے

مسکراہٹیں، گھنٹیاں، صف آرا جلوس

حسین وجمیل عورتیں، تنگ دھڑنگ پجاری یا پجارنیں

لہو کی عمیق الوہیت سے

وصال کی متمنی ہیں، انہیں

جلوسوں میں شریک ہونے دو،

گھڑیالوں کو نفسانی رچاؤ کے احتشام کی

منادی پیٹنے دو،

ہم ان پُر لطف رسوم کے بچوں کو پالیں گے، پیار کریں گے

سورج میری روشنی تھی، وہ

میرا محافظ تھا جس سے کاروبار انجام پائے

زمین میری ماں کی طرح،

میری جائے پناہ تھی، بادل چھت

بادل باپ بن کر، اپنی دختر، زمین کو

آب باراں کی صورت، قائم کرتا،

کرن کی صورت نطفہ سے حمل قائم کرتا، مگر

اندر دیوراج نے گوتم کی عورت سے

زنا کیا جس پر گوتم (چاند) نے بددعا دی

تو پتھر کی سل بنا جائے

رامچندر کی خاک پا چھونے سے

بددعائیں نہیں ٹلتیں

میں دھیان کرنے بیٹھتا ہوں تو،

میرا من نچلا نہیں بیٹھتا،

کبھی کابل گھوڑے خریدتا ہے کبھی

گائے کے پیچھے بھاگتا ہے جو رسی تڑوا کر

گھر سے باہر نکل گئی ہے،

میری پیدائش سے اضطراب مجھ میں

داخل کر دیا گیا ہے

میں وحدت کی طرف آتا ہوں،

لیکن گیان کا عکس منعکس نہیں ہوتا

میرا دھیان تو یونان کی گھاٹیوں میں پڑا ہے

میری ہراپاسنا کا ایک ہی پھل ہے،
جب سے میں نے دھیان جمانے کی مہارت پائی ہے،
میں اس کا بھکاری بن گیا ہوں،
لگتا ہے، میں سام ویدی ہوں،
اپنے گانے میں اسی کی پوجا کرتا ہوں،
میرا سارا دھیان اس کی طرف لگا رہتا ہے،
یہی میری تفریح کا سامان ہے،
تیری حرارت روشن اور لطیف دیوتاؤں کی طرح
ہوا میں سب جگہ محیط ہے
وہ آگ اور روشنی کے ذریعہ اور اپنے رس کے واسطے سے
مجھ میں سرایت کئے ہوئے ہے
یہ اشون،
حمر بھری اور اتر پھری ہیں،
ان سے سمندروں میں موتیوں کی مانند
اوج پیدا ہوتی ہیں،
میری سواریاں مجھ میں دولت، قوت اور حشمت
پیدا کرتی ہیں۔
اس نے جانے سے پہلے مجھے،
سمندر، زمین اور انترکش کی سواریاں
عطا کردی تھیں، جن پر میں

نہایت روشن آکاش کے اندر اڑتا،

بڑی تیزی سے، اس کے

استھان پر برابر حاضر دیتا رہوں

تا آنکہ ایک دن ہم پھر، وہ منتر گا سکیں

جن کو لوگ اب گیت کہتے ہیں

برہم آنند کے اس خزانہ کے سامنے

دینوی دولت ہیچ ہے وہ ہرگز،

اس کی برابری نہیں سکتیں

پھر مجھے بھی کسی اور عزت کی خواہش نہیں

سسیا سنتوں کی برہم یکیہ مجھ سے قیام کرتی ہے،

محبت وہ لفظ ہے، جو عالموں اور عارفوں کی

پر تکیہ ہے،

علم اور محبت سے بے بہرہ لوگ، تمام عالم پر

محبت کی نظر رکھتے ہیں،

یہی بھوت یکیہ ہے،

میں اپنے زایچوں کو اگر کھول دوں تو تم،

اپنے مقصود سے باہر نکل جاؤ گے

یونان سے نکل جاؤ گے

یا بڑی دوشیزائیں، زئیس اور تیموسین

ان کی بیٹیاں، رزمیہ شاعری، تاریخ، غنائیت،

المیہ نگاری، رقص وسرور، تغزل، عارفانہ شاعری
فلکیات اور طربیہ نگاری سے جڑی تھیں
میں......زیس......آسمان کا بیٹا تھا،
میں نے اسکی یاد میں، ترلوک بنایا جس کے
تین بیٹے پیدا ہوئے،
سورگ لوک، پاتال اور مرگ لوک
اسی نسل میں، ۶۲۰ قبل مسیح،
لیسبوس کے ایک امیر گھرانے میں،
سیفو کا سودائی اور معاصر تھا،
وہ عشق، جنگ اور شراب کا رسیا تھا
جس نے سیفو کے بعد، ریس لینڈا سے
ہنس کی شکل میں مباشرت کی،
سیفو نے اُس سے کہا،
میری نگاہوں میں تم کچھ بھی نہیں ہو
اڑ چلا رنگ فاختاؤں کا،
دل ہوئے سرد مست سینوں میں
گر پڑے بازوؤں پہ تھک کے پر
مگر اے،
عطیس اپنی محبوب کلطوررانی
ملاحت گر، جس کے زیرنگیں ہے

گلستان سر دیس کے زنگ دبو میں
وہ چمپا کلی، ہم کو بھولی نہیں ہے[1]

(میرا آج کا شہر،
گندے پاؤں پسارے، دریا کے کنارے
لیٹا ہے جہاں میرے سینے پر رینگتی چیونٹیاں
سورج کو گھورتی ہیں[2]

میرا یہ ہانپتا ہوا سانس،
کیا یہ میرا سانس ہے،
کبھی نہ ختم، ہونے والا سانس
کمرے میں گھپ اندھیرا ہے،
کھڑکی کے شیشوں میں ایک برفانی روشنی
چمک رہی ہے،
وہی ہے، جس نے لیسبوس کے
شوہر کو بری طرح ڈھانپ لیا تھا،
جس میں صرف بھوک اُگ آئی تھی اور سارے راستے
بند تھے،
یہ صرف، ایک بار پھر، کسی قدیم سفید نحوست کی طرح
چھتوں اور گلیوں کو دفن کرنے کے درپے تھی
سکوت توڑنے کے لیئے کچھ ڈھال' کتنے بجے تھے

۱۔ عبدالعزیز خالد ۲۔ عین رشید

جو بھونکنے کی بجائے بلیوں کی طرح روتے تھے

یہی برف تو میری یادوں کا حصّہ تھا جس نے

رات کے ساتھ کتنی ہی اور راتوں کو

موڑ دیا تھا،

وہ ماضی سے میرے اس پہلے اکیلے پن کو

باہر گھسیٹ لائی اور نظارے اور نیند کو

ایک یاد میں منقلب کر دیا

جونہی میں نے کروٹ بدلی، بستر کی شکنیں

ابھی تک گرم تھیں، کوئی میری آنکھ کے کھلنے سے پہلے

بغیر آواز پلنگ چھوڑ کر، کھڑکی سے کود گیا تھا

اب چھت پر صرف سورکی پرچھائیاں

لٹک رہی تھیں، اور اس سے خون کی بوندیں

ٹپک ٹپک کر تکیئے کو گیلا کر رہی تھیں،

یہ اس واقعے کا آخری منظر ہے،

جو میرے پاس رہ گیا ہے جو آنے جانے والے بخار کی طرح

اتنے برسوں کے بعد بھی،

لوٹ لوٹ کر میرے پاس آتا رہتا ہے

میری جلد پسینے سے لت پت ہو کر،

بستر کی چادر سے چپک جاتی ہے جس کے وسط میں،

اونی بھرت کو پھاڑ کر،

سانپوں کے ایک گروہ نے،

ایک سرنگ بنالی ہے

جبر کے ذائقے

لفظ ادا نہیں کرتے

یہ عہد تو رگوں میں سرایت کرتا ہے

اس سفر میں، میری عمر کے دن،

بے چین بستیوں کی دربدری میں گزرے ہیں

زمین لوگوں سے خالی ہوگئی، بازار گم ہوئے

تنہا راتوں میں کوئی گھر سے نکلتا نہیں،

مل بھی جائے تو ہمارے درمیان صدیوں کا بعد ہے،

ٹھنڈی راتوں کے جزیرے مر گئے

میرا ذہن، بے رنگ اور جامد حقیقت سے

انقطاع کر چکا،

اب مجھے تحلیل کی نادیدہ اور متنوع قوتوں کا سامنا ہے

میں نے اپنی محبت کو زندہ رکھنے کے لیئے

جسم کو طول دینے کا یہی راستہ مناسب سمجھا

زندگی اور تعمیر کے لیئے

توڑ پھوڑ ضروری تھی،

بغاوت اور تخریبی قوتوں کے حصول کے لیے

فطرت کی نمائندگی ضروری تھی، سو میں جو کچھ

دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، محسوس کرتا ہوں،

ماضی، حال اور مستقبل کی قید سے
باہر نکل کر بیان کرتا ہوں
میرے سُر، اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کے
مفہوم سمجھاتے ہیں، مگر
یہ ہجر کی شاعری ہے،
اس میں، ایک، عجیب سی ویرانی ہے،
ایک جان لیوا بانجھ ہے اور وہ لمحے
جو ہماری زندگیوں کے بیشتر حصّوں پر
طاری تھے، میری زندگی میں سب سے زیادہ
تھکا دیتے ہیں، خوفزدہ کردیتے ہیں
میرے ہاتھ سوج جاتے ہیں، پھر میں
چھڑی کا سہارا لے کر چلتا ہوں،
میرے پھیپھڑوں میں دھویں کی ایک چیختی ہوئی لکیر،
میرے ست رو جس دم کو پہچان کر،
میرے اندر خشک جھاڑیوں کو آگ لگا دیتی ہیں
مجھے وہ مکان یاد ہے جو اس کے
مرتے ہی اس کے قبضے سے نکل گئی تھی
اسکی سڑک کے کنارے کھڑی دیواریں
مجھے یاد ہیں، یہ اس شہر کے مقفل ہونے والا
پہلا مکان تھا، رفتہ رفتہ
تمام لوگ یہاں سے رخصت ہو گئے

وہ بوڑھے میاں بیوی بھی جو چھوٹے لڑکے کے ساتھ
مکان کے صدر دروازے کے باہر
کھانا ملنے کی آس میں ہمیشہ تنہا بیٹھتے تھے
میرے چلے آنے کے بعد، سنا ہے،
ان کے جسم ہولناک طور پر مسخ کر دیئے گئے
ایک بار میں نے گزرتے ہوئے، اس لڑکے کی
حیوانی چیخیں اور کراہیں سنی تھیں جن کے بارے میں
شہر کے لوگ باتیں کرتے تھے،
انہیں رات کی تاریکی میں، گھنٹیوں کی آواز کے بعد
دفنا دیا گیا اور وہ سیفو کی خاموشی کے بوجھ تلے
غائب ہو گئے۔
اس لڑکے کا سایہ، اُس مکان پر اس وقت تک
نحوست کی طرح منڈلاتا رہا، جب تک اس دیواریں
شکستہ ہو کر ڈھینے لگی تھیں،
راستے کے وہ کتے بھی، جو اُس روز مجھ پر
بھونک رہے تھے، اس بار، میری جیکٹ اور
پتلون کے ساتھ اٹک گئے تھے
اچانک ایک کتیا کے بال کھڑے ہو گئے تھے
اس نے دانت نکوس لیئے تھے اور پنجے
پتھریلے فرش پر گاڑ کر زور زور سے بھونکنے لگی
سانپ، ست رفتاری سے دروازے کے نیچے

سرک کر، مکان کے اندر، نا قابل تصور گہرائیوں میں
ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے غائب ہو گیا،
اس نے کتے کے سر پر کاٹا تھا،
وہ چار دن موت سے تنہا، وحشت انگیز جنگ لڑتا رہا
میں جس زمانے میں تھا، اس کی زبان وہاں کے لوگ سمجھ نہ سکتے تھے
مجھے جاننے والا، وہاں کوئی نہ تھا، جسے مدد کے لیئے پکارا جا سکتا
میرا حافظہ زرّوں میں بٹ چکا ہے،
واقعات کا آنا جانا، سرسامی منظروں تک محدود ہے،
اس کے باوجود دور دکھائی دینے والی ایک چمک ہے،
ایک بھنبھناہٹ ہے، جو موت کی دہلیز سے
بچ کر، میرے ساتھ زندہ ہے،
میں آدھا خواب ہوں اور آدھا ہڈیاں،
میں جب بھی کھڑکی کھولتا ہوں،
وہ مجھے نظر آتی ہے،
وہی لباس جو اُس نے آخری بار پہنا تھا،
دروازے کے قریب کتیا کی گود ایک عجیب الخلقت بچہ ہے
جس کا سر، بدہیئت، پیٹھ پر گھوڑوں کی ایال
اپنے ہاتھوں میں کتے کا سوجا ہوا سر،
پیچھے ایک مردہ ہنسی ہے جو زمین کی گہرائیوں سے
باہر آن کر مرے دماغ میں یوں گونج رہی ہے،
جیسے کبھی تھمنے والی نہیں،

اب میں ایک ایسا دیوتا ہوں جو بالکل

غیر مجسم ہے،

مادوں میں مادی (بھوتک) دیوتاؤں کی پوجا لکھی ہے

لوگ زمانہ قدیم سے، ویدوں کی ہدایت کے مطابق

میری اپاسنا کرتے آئے ہیں،

منتروں کے مطالب کو،

کماحقہ، جاننے والے رشی

منتر اور پران (یوگ) یا دلیل (ترک) ستتی (حمد وثنا)

کرتے رہے ہیں،

اور آئندہ بھی کریں گے

پراچین (متقدمین) اور نوین (متاخرین) کہلانے والے

دونوں قسموں کے رشیوں کا ممدوح (پرمیشور) میں ہی ہوں،

کسی امر کی تدبیر صائب یا ہدایت العمل ہے

سکھ کی خواہش والا، اگنی ہوتر کرے،

سب اندریوں نے دیوتاؤں (عالموں) کو جیت لیا ہے

ایسا کرنے سے مرادیں ملتی ہیں، فتح نصیب ہوتی ہے،

بازگشت زندہ ہوتی ہے، کشف زمانہ تخلیق ہوتا ہے،

برہم ودیا ملتی،

اندریوں کی دیوی سے ملاقات ہوتی ہے۔
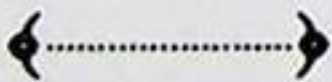
شاہد زبیر کی یہ طویل نظم فکر و اظہار پر دو اعتبار سے توجہ طلب تحقیقی رویوں کی حامل ہے کہ اس میں معنی کا بکھراؤ درحقیقت اپنی ذات کے بکھراؤ کے ساتھ جڑا ہے اور جس طرح پوری نظم میں معنی اپنی وحدت کی قوس میں سرگرداں ہیں اسی طرح شاعر اپنی ذات کی شناخت کا جتن کرتا دکھائی دیتا ہے اس کے لیے وہ ماضی و حال کو بہ طور استعارہ استعمال کرتا ہے اور استعارے کی معنویت اور پہلوؤں سے اپنے ہونے کا جواز تلاشتا ہے۔ نظم میں بولنے اور سننے والا اگرچہ ایک ہی فرد ہے تاہم یہ گویائی اور سماعت کا عمل و تاریخ اور عصر حاضر کی حیثیت کے ساتھ ملکر ایک اجتمائی تجربے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ ایک ایسا اجتماعی تجربہ جہاں ماضی کی معنویت حال کی لایعنیت کو ظاہر کرتی ہے اور شاید یہی لایعنیت (Abus) ہمارا مستقبل بھی ہے۔

شاہد زبیر اپنی آواز کی طاقت مگر اس کی نحیف ''بازگشت'' کو مزید کمزور ہوتا دیکھتے ہیں۔ اور یہی المیہ شاید اس نظم کے بطون میں موجود ہے کہ آواز کی معنویت کس طرح ''بازگشت'' کی لایعنیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ''یہی آواز کی طاقت'' ماضی اور تہذیبوں کی طاقت ہے۔ نظم میں یونانی سیفو کی آواز، مصر کے احرام، ہندو صنمیات کے کردار اور دیومالائی فضا نے بہ طور استعارہ نظم کے کینوس کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ تاہم ''بازگشت'' کی لایعنیت ان تہذیبوں کی بازگشت بن کر رہ گئی ہے۔ اور اب نئے رویے، نیا نظام اور نئے اقدار نظام میں ماضی کی ''بازگشت'' کہیں سنائی نہیں دیتی۔

ڈاکٹر عامر سہیل

DASTAK PUBLICATIONS
Gulgasht Colony, Goal Bagh, Multan
Cell: 0302 7766622
Email: dastakpublication@yahoo.com

Rs. 200/-